تاریخ کے نظریات

ڈاکٹر مبارک علی
استاد شعبہ تاریخ جامعہ سندھ

تاریخ کے نظریات

نگارشات

تاریخ کے نظریات

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI

ڈاکٹر مبارک علی

استاد شعبہ تاریخ جامعہ سندھ

نگارشات

۴- بیگم روڈ، لاہور

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No: 025737
★ MAILSI ★
TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

ناشر :- مصطفیٰ وحید
۴- بیگم روڈ- لاہور
مطبع :- ایچ- وائی- پرنٹرز لاہور
قیمت :- تیس روپے

فہرست

صفحہ

(۱) ابنِ خلدون ۱
(۲) ویکو ۱۷
(۳) کانٹ ۲۷
(۴) ہرڈر ۳۸
(۵) ہیگل ۴۸
(۶) مارکس ۵۸
(۷) بک ہارڈٹ ۷۰
(۸) وینی لوسکی ۹۶
(۹) اسپینگلر ۱۰۲
(۱۰) کولنگ وڈ ۱۱۹
(۱۱) رینائر ۱۳۹
(۱۲) ای۔ایچ۔ڈانس ۱۴۹
(۱۳) کروچے ۱۶۲
(۱۴) ٹائن بی ۱۷۱
(۱۵) وِل ڈیورانٹ ۱۸۲

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI

(۱)	[illegible]	
(۲)	[illegible]	۱۵
(۳)	[illegible]	۲۵
(۴)	[illegible]	۳۶
(۵)	[illegible]	۴۶
(۶)	[illegible]	۵۸
(۷)	[illegible]	۷۰
(۸)	[illegible]	۹۴
(۹)	[illegible]	۱۰۲
(۱۰)	[illegible]	۱۱۴
(۱۱)	[illegible]	۱۲۹
(۱۲)	[illegible]	۱۶۴
(۱۳)	[illegible]	۱۷۲
(۱۴)	[illegible]	۱۸۱
(۱۵)	[illegible]	۱۸۲

پیش لفظ

والٹیر نے سب سے پہلے فلسفۂ تاریخ کی اصطلاح استعمال کر کے اس جانب توجہ مبذول کرائی کہ تاریخی واقعات کے پسِ منظر میں انسانی ذہن اور فکر کی تبدیلیوں کا مطالعہ کیا جائے اور یہ تجزیہ کیا جائے کہ تاریخی واقعات کن منصوبوں کی تکمیل کر رہے ہیں اور تاریخ میں جو کچھ رونما ہوا ہے اس کا کیا مقصد ہے؟ جرمن مفکرین نے خصوصیت سے فلسفۂ تاریخ کے موضوع کو اپنا کر اس کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا، جس کی وجہ سے علمِ تاریخ کو سمجھنے میں مدد ملی۔

ابتداء میں مفکرین نے تاریخی واقعات میں کوئی تسلسل اور ربط ڈھونڈنے کی کوشش کی اور تاریخ میں کسی منصوبہ کو تلاش کیا، تاکہ تاریخی واقعات اور ان کے نتائج کو سمجھا جا سکے۔ اس سلسلہ میں یہ کوشش بھی کی گئی کہ تاریخ میں ان ٹھوس قوانین کو دریافت کیا جائے جو تاریخ کے راستہ کو متعین کرتے ہیں۔

علمِ تاریخ کو سمجھنے کے لئے فلسفۂ تاریخ کا مطالعہ انتہائی اہم اور ضروری ہے۔ اس مقصد کے لئے اس کتاب میں پندرہ مفکرین کے نظریات کو پیش کیا گیا ہے جنھوں نے فلسفۂ

تاریخ کے موضوع پر اہم فکری اضافے کئے ہیں۔

یہ مقالات انجمن ترقی اردو کے ماہنامہ "قومی زبان" میں سلسلہ وار شائع ہوئے۔ رسالہ کے ایڈیٹر جناب شبیر علی کاظمی مرحوم نے ان کی اشاعت میں خصوصی دلچسپی لی۔ جناب شہزاد منظر صاحب نے ان کی اشاعت سے پہلے سنسرشپ کے فرائض سر انجام دیئے۔

[illegible]

شعبۂ تاریخ،

سندھ یونیورسٹی، جام شورو

ابنِ خلدون

عبدالرحمٰن ابن خلدون ۱۳۳۲ء میں تونس میں پیدا ہوا۔ بیس سال کی عمر میں اس نے مروجہ علوم میں دسترس حاصل کی۔ شمالی افریقہ اور اندلس کی مسلمان حکومتوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔ آخر زندگی میں اس کا قیام مصر میں رہا۔ ۱۴۰۰ء میں دمشق کے محاصرے کے موقع پر اس کی ملاقات امیر تیمور سے ہوئی۔ اس نے ۷۴ سال کی عمر میں ۱۴۰۶ء میں مصر میں وفات پائی۔

عبدالرحمٰن ابن خلدون نے تاریخ کے واقعات و حوادثات کو سمجھنے کیلئے کچھ اصول و قوانین دریافت کئے اور ان کی روشنی میں ان تاریخی واقعات کی تاویل و تفسیر کی۔ ابن خلدون سے پہلے تاریخ میں ہونیوالے واقعات، تغیرات اور انقلابات کو صرف اس حد تک سمجھا جاتا تھا کہ قوموں کے عروج و زوال سے عبرت حاصل کی جائے

لیکن اب تک اس پہلو پر غور و فکر نہیں ہوا تھا کہ سلطنتوں اور تمدنوں کے اس عروج و زوال کے پس منظر میں کون سے عوامل ہیں۔ ابن خلدون کو اس لحاظ سے موجودہ مشرقی اور مغربی فلسفیوں اور مفکروں پر فوقیت حاصل ہے کہ اس نے اقوام کی زندگی میں ہونے والے ان تغیرات و انقلابات و حوادثات کے اصول دریافت کئے۔

ابن خلدون کے فلسفۂ تاریخ کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ اس کے ماحول اور اس کے ماخذ پر ایک نگاہ ڈالی جائے: فلسفۂ تاریخ کے یہ اصول دریافت کرتے وقت اس کے سامنے اسلامی تاریخ اور اس میں ہونیوالے انقلابات تھے۔ خصوصیت سے مشرق و مغرب کی اسلامی سلطنتوں کی تبدیلیاں، حکمران خاندانوں کا عروج و زوال، اور عرب و بربر قبیلوں کی زندگی کے تغیرات۔ ابن خلدون نے ان حالات کو پیش نظر رکھ کر تاریخ کی تشریح اور تاویل کی۔ لیکن آج جب کہ دنیا کی تاریخ کے بہت سے تاریک پہلوؤں سے پردہ اٹھ چکا ہے اور دنیا کی تاریخ تحقیق کے ساتھ نئے سرے سے تدوین ہو رہی ہے، اس پر ابن خلدون کے بہت سے اصول اور کلیے شاید منطبق نہ ہوں، کیونکہ اس کے سامنے صرف اسلامی تاریخ کا نمونہ تھا اور وہ دنیا کی دوسری اقوام اور ان کے تمدنوں کے ارتقاء اور زوال سے ناواقف تھا۔ لیکن ان تمام کمزوریوں کے باوجود اس کا مقام فلسفۂ تاریخ میں اولیت کا ہے۔

ابن خلدون نے اپنے مقدمۂ تاریخ میں مختصراً تاریخ اور تاریخ نویسی

پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے اور اس بات پر بحث کی ہے کہ تاریخ میں مبالغہ آمیزی اور جھوٹی روایات کس طرح داخل ہو جاتی ہیں ۔ ان غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اس نے اپنے زمانے کے لحاظ سے جرأت کرتے ہوئے مذہب کو سب سے زیادہ ذمہ دار ٹھہرایا ہے : کیونکہ مذہب انسان کے ذہن کا اعتدال ختم کر دیتا ہے ۔ جب تک ذہن اعتدال پر ہوتا ہے اور کوئی بات سنتا ہے تو اس کو پرکھنے اور اس کے جھوٹے اور سچے ہونے کیلئے پہلے اچھی طرح سے اس کی تحقیق و تصدیق کرتا ہے ۔ لیکن اگر ذہن پر مذہبی غلبہ ہو تو وہ ہر اس خبر اور واقعہ کو فوراً صحیح تسلیم کر لیتا ہے جو اس کے مذہب و عقائد کے مطابق ہوتی ہے کیونکہ مذہبی اثر سے اس میں تحقیق کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے ۔

ایک دوسرا سبب جس کی وجہ سے تاریخ میں غلطیوں کا رواج ہوا وہ بادشاہوں، سلاطین اور امراء کی خوشامد اور تعریف کی وجہ سے ہوا ، ان کو خوش کرنے کیلئے مورخین نے بہت سی جھوٹی خبروں کو تاریخ میں لکھ کر شہرت دی اور یہ جھوٹ تاریخ کا ایک حصّہ ہو گیا ۔

ابنِ خلدون تاریخ میں مسلسل تغیّر و تبدّل پر یقین رکھتا ہے ۔ اس کے نزدیک ہر زمانے میں قوموں کی زندگی ، ان کے اخلاق و عادات و اطوار بدلتے رہتے ہیں ۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی قوم یا معاشرہ ایک ہی حالت پر برقرار رہا ہو ۔ معاشرہ کا یہ تغیّر و تبدّل حکومتوں کی تبدیلی کی وجہ سے ہوتا ہے کیونکہ لوگ حکمرانوں کی تقلید کرتے ہیں اس لئے حکومتوں کے بدلنے سے لوگوں کے افکار ، خیالات و نظریات بھی بدلتے رہتے ہیں ۔ ہر حکومت اپنے ساتھ جداگانہ قدریں لاتی ہے

اس لئے حکومتوں کے بدلنے سے تہذیب و ثقافت میں ہمیشہ تبدیلی آتی رہتی ہے۔

ابن خلدون جب انسانی اجتماع یا معاشرے کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے ان مختلف انسانی اجتماعوں میں مشابہت و مخالفت دونوں عناصر ملتے ہیں۔ مشابہت کے عناصر میں سب سے اہم عنصر تقلید کا ہے ہر معاشرے میں رعایا حاکم کی، مفتوح فاتح کی اور فاتح مفتوح کی تقلید کرتا ہے۔ مشابہت کے یہ عناصر ہر دور میں پائے جاتے ہیں۔ چاہے ماضی ہو یا حال اور یا مستقبل۔ ابن خلدون کہتا ہے کہ ماضی مستقبل کے ساتھ اس سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے جس قدر پانی پانی سے۔ یہاں ابن خلدون ان مورخین پر کڑی تنقید کرتا ہے جو ماضی کے انسانوں کے بارے میں مبالغہ آمیز کہانیاں بیان کرتے ہیں۔ ان کے چھوڑے ہوئے آثار، بلند و بالا عمارات اور پرشکوہ تعمیرات سے وہ یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ زمانہ ماضی کا انسان بہت قیم شہیم، طاقتور اور زیادہ عمر پانیوالا تھا۔ ابن خلدون کہتا ہے کہ ماضی کے انسان نے استعمال کی جن اشیاء کو چھوڑا ہے، جیسے مکانات، کھانے پینے کے برتن اور اوزار، ان کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی اپنے قد و قامت، اور اطوار میں ہماری طرح ہی کا انسان تھا۔ ہاں اس کی تعمیر کردہ عظیم الشان عمارتوں اور آثاروں سے ہمیں اس کی ذہنی ترقی کا پتہ چلتا ہے۔
ابن خلدون انسانوں میں رنگ و نسل کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں کرتا۔ کیونکہ جلد کی رنگ آب و ہوا کی وجہ سے ہوتی ہے جو انسان کو سیاہ یا سفید بناتی ہے ورنہ انسان رنگت کے باوجود انسان رہتا ہے۔

تشابہت کے ساتھ ساتھ انسانی معاشروں میں مخالفت بھی پائی جاتی ہے اور ان کی عادتوں میں فرق بھی ہوتا ہے، اس کی سب سے بڑی وجہ تو جغرافیائی ماحول اور آب و ہوا ہے۔ انسانی اجتماع گرم و سرد اور معتدل آب وہوا سے متاثر ہوتا ہے۔ ابن خلدون انتہائی گرم اور سرد خطوں کے لوگوں کو غیر مہذب قرار دیتا ہے کیونکہ شدید موسمی اثرات انہیں جسمانی طور پر ناکارہ بنا دیتے ہیں۔ معتدل آب و ہوا کے خطوں میں تہذیب و تمدن زیادہ ترقی کرتا ہے کیونکہ اس خطہ کے لوگ اپنے اخلاق میں کامل ہوتے ہیں۔ انہیں خطوں میں پیغمبر آتے ہیں، یہیں شہر بستیں پھیلی ہیں، علوم و فنون کی اشاعت ہوئی ہے اور تہذیب تمدن، و ثقافت نے ترقی کی ہے۔ یہ لوگ شمالی افریقہ، شام و حجاز، عراق، ہند، سندھ، چین اور اندلس کے لوگ ہیں۔

ابن خلدون انسان کی اجتماعی زندگی میں پیدا ہونے والے واقعات، تغیرات، اور حادثات کو حادثاتی تصور نہیں کرتا۔ یہ خود بخود پیدا نہیں ہوتے بلکہ یہ تغیرات ایک نظام کے تحت عمل میں آتے ہیں۔ کچھ ایسے قوانین ہیں جو انسان کو اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ اجتماعی زندگی بسر کرے۔ انسان کیلئے یہ اجتماع اس لئے ضروری ہے کہ وہ بغیر دوسروں کی مدد اور شرکت کے تنہا زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ انسان کی جبلت ہے کہ وہ مل جل کر رہے۔

سماجی و معاشرتی اجتماع کے علاوہ ایک اور اجتماع ہے جسے سیاسی اجتماع کہا جاتا ہے۔ یہ اجتماع فطری جبلت پر نہیں بلکہ انسان کی عقل و دانش اور فکر کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے اور یہی چیز انسان

وحیوان کو ایک دوسرے سے ممیز کرتی ہے۔ اس سیاسی اجتماع کی تشکیل
کے بعد انسان چاہتا ہے کہ اس کے مفادات کے تحفظ کیلئے ایک طاقتور
شخصیت ہو جو معاشرے میں امن وامان اور عدل وانصاف قائم
رکھے۔ اس مرحلہ پر انسانی معاشرے میں حکومت کی بنیاد پڑی۔
سیاسی اجتماع سے ابن خلدون ایک منظم سلطنت، قوم، یا ریاست
مراد لیتا ہے۔ اس سیاسی اجتماع کے تغیرات، انقلابات اور
عروج وزوال کو وہ اپنا موضوع بناتا ہے۔ یہاں ابن خلدون
روایتی اسلامی انداز فکر سے ہٹ کر یہ بات کہتا ہے کہ سیاسی اجتماع
کیلئے نبوت کا ہونا ضروری نہیں، کیونکہ ایسے بہت سے سیاسی اجتماعات
ہیں جہاں کوئی نبی نہیں آیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے
کہ زیادہ متمدن سیاسی اجتماع کیلئے نبوت کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔
انسانی معاشرے یا اجتماع پر جغرافیائی اور آب وہوا کے اثرات
پر روشنی ڈالتے ہوئے ابن خلدون اس بات کی جانب اشارہ کرتا ہے
کہ خوش حال اور فارغ البال قومیں زیادہ صحت مند نہیں ہوتیں کیونکہ
جو خطے یا ممالک سرسبز اور شاداب ہوتے ہیں اور جہاں روزی حاصل
کرنے کیلئے زیادہ محنت ومشقت نہیں کرنی پڑتی وہاں غذا کی
کثرت اور وافر تعداد صحت کو خراب کر دیتی ہے۔ آرام پسندی
وعیش وعشرت نہ صرف جسمانی ضعف پیدا کرتا ہے بلکہ ذہن کو
بھی کند کر دیتا ہے۔ ایسی قوم جنگی اوصاف اور خصلتوں سے محروم ہوجاتا
ہے۔ اس کے مقابلہ میں جو قومیں بنجر علاقوں میں رہتی ہیں، سادہ
غذا استعمال کرتی ہیں اور محنت ومشقت سے روزی کماتی ہیں وہ
زیادہ صحت مند، چاق وچوبند اور بہادر ہوتی ہیں۔

اسی طرح شہری اور دیہاتی زندگی میں فرق ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ معاشرے میں تہذیب کی ابتداء دیہات سے ہوتی ہے پھر یہ تہذیب شہروں میں اپنے کمال کو پہونچتی ہے۔ کیونکہ جب دولت ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو عمدہ کھانے، آرام دہ مکانات اور بہترین لباس کی خواہش ہوتی ہے۔ شہروں میں رہنے والے جو صنعت و حرفت کا پیشہ اختیار کرتے ہیں اس میں وہ دیہات کی نسبت زیادہ کماتے ہیں۔ لذتوں کی فراوانی اور سامانِ آسائش برے اخلاق کو پیدا کرتا ہے۔ اس کے برعکس دیہاتی زندگی سادہ ہوتی ہے۔ اور ان کے اخلاق بھی سادہ ہوتے ہیں۔
چونکہ شہری زندگی تمدن کے لحاظ سے کمال کا درجہ ہے اس لئے یہاں زوال کی علامتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ زوال کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ شہری اپنی زندگی اور مال و دولت کی حفاظت اپنے حاکموں کے سپرد کر دیتے ہیں اور شہروں کے گرد فصیلیں بنوا کر اپنا دفاع کرتے ہیں۔ اس لئے اندرونی و بیرونی خطروں سے حفاظت کا احساس بہادری، حوصلہ و ہمت کے جوہر ختم کر دیتا ہے۔ جبکہ بدو جو کہ چٹیل میدان اور گھنے جنگل میں بغیر کسی حفاظت کے رہتے ہیں انھیں اپنے دفاع کیلئے ہر وقت چوکس رہنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے ان میں بہادری، شجاعت اور خطرات سے مقابلہ کا حوصلہ باقی رہتا ہے۔
اس کے علاوہ شہری نہ تو ذہنی طور پر آزاد ہوتے ہیں اور نہ ان میں اظہارِ آزادیٔ رائے کی جرٲت ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے حاکموں کے ماتحت محکومی کی زندگی گذارتے ہیں۔ صرف امراء و

روساء جو صاحب اقتدار ہوتے ہیں وہ خود مختار ہوتے ہیں۔
شہروں میں طرزِ حکومت بھی شہریوں میں تبدیلی لاتی ہے۔ اگر حکومت آزاد خیال ہوتی ہے تو شہریوں میں بھی آزاد خیالی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں لیکن اگر حکومت استبدادی ہوتی ہے تو ان کی تمام آزادی سلب کر لی جاتی ہے۔ حکومت کی سختی اور تعزیری سزائیں شہریوں کی خودداری اور حمیت کو ختم کر دیتی ہیں۔ جن کی پرورش تادیبی ماحول میں ہوتی ہے ان کی عزتِ نفس ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے بدو عالی ہمت و عالی حوصلہ ہوتے ہیں جب کہ شہری قوانین اور آئین کی زنجیروں میں بندھے غلام ہوتے ہیں۔ اس کی مثال ان طالب علموں سے دی جا سکتی ہے جو علماء و اساتذہ کی مجلسوں میں ادب و خوف سے علم حاصل کرتے ہیں اور ان کی ہیبت و خوف سے طالب علموں کی جرأت و حوصلہ ختم ہو جاتا ہے۔

ابن خلدون مشرق و مغرب کی اسلامی سلطنتوں اور حکومتوں کے عروج و زوال میں جو سب سے زیادہ اہم عنصر دیکھتا ہے وہ "عصبیت" ہے۔ عصبیت قبیلہ کی سیاسی، معاشرتی اور سماجی زندگی میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اسلامی تاریخ کی روشنی میں وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اسلام کے ابتدائی چالیس سال چھوڑ کر باقی پوری تاریخ عصبیت کی تاریخ ہے۔ یہ عصبیت کا جذبہ ہی ہوتا ہے جو ایک قبیلہ میں اتحاد و اتفاق برقرار رکھتا ہے اور اس اتحاد کی بدولت قبیلہ کی ترقی ممکن ہوتی ہے۔
ابن خلدون کہتا ہے کہ قبیلہ کے تمام افراد ایک جیسے نہیں ہوتے۔

ان میں کچھ ذہین ہوتے ہیں، کچھ بہادر اور شجاع، بعض اوقات ایک فرد میں یہ تمام اچھے اوصاف جمع ہو جاتے ہیں اور اس ایک فرد کی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے اس کا خاندان شرافت و عزت اور بہادری و شجاعت میں مشہور ہو جاتا ہے اور یہ اوصاف اسے دوسرے خاندانوں پر افضلیت عطا کرتے ہیں۔

لیکن یہ افتخار اور شرافت ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں ہوتی ہے۔ ایک خاندان میں یہ اوصاف زیادہ سے زیادہ چار نسلوں تک رہتے ہیں۔ خاندان کا بانی اپنے اوصاف کی ترقی کا موجب ہوتا ہے۔ اس کا بیٹا باپ کے نقش قدم پر چلتا ہے، پھر اس کا بیٹا اس کے نقش قدم پر، اس طرح تیسری اور چوتھی نسل مقلد ہو کر رہ جاتی ہے۔ ان میں ذاتی خوبیاں اور اچھے اوصاف پیدا نہیں ہوتے۔ وہ "پدرم سلطان بود" کے تصور میں محو رہتے ہیں اور اس مغالطے میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ یہ اوصاف انہیں ورثہ میں ملے ہیں۔ وہ خود کو معزز اور قابل احترام گردانتے ہیں اور احساس برتری کا شکار ہو کر دوسرے افراد کو حقارت سے دیکھتے ہیں۔ اس مرحلہ پر لوگ ان سے بددل ہو جاتے ہیں اور اس خاندان کے بجائے دوسرے خاندان کے کسی اہل شخص کو اپنا سردار بنا لیتے ہیں۔ اس طرح سے اقتدار ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ خاندان کے باعزت اور ممتاز ہونے کیلئے چار نسلوں کی شرط ضروری نہیں۔ کیونکہ کبھی کبھی اس کا زوال تین نسلوں کے بعد ہی ہو جاتا ہے۔ لیکن چار کے بعد یہ زوال یقینی ہوتا ہے۔ یعنی پہلا بانی، دوسرا عمارت کا نگراں، تیسرا مقلد اور چوتھا شرف و عزت کو کھونے والا۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، ابن خلدون عصبیت کو قبیلہ کے اتحاد اور ترقی کیلئے ضروری سمجھتا ہے۔ اگر ایک قبیلہ میں مختلف خاندان ہیں تو ان کے اتحاد کیلئے بالادست عصبیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ بالادست عصبیت نہ ہو تو قبیلہ میں اختلافات بڑھ جاتے ہیں۔

لیکن بالادست عصبیت قبیلہ کو نہ صرف متحد کرتی ہے بلکہ ان میں اس خواہش کو بھی بیدار کرتی ہے کہ پڑوسی ملک پر حملہ کر کے لوٹ مار کی جائے۔ اگر پڑوسی ملک کی عصبیت کمزور ہوتی ہے تو وہ مفتوح ہو جاتا ہے۔ ورنہ حملہ آور قبیلہ ان سے مغلوب ہو کر ان کی سلطنت کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ جیسے عباسی دورِ حکومت میں ترک ان سے مغلوب ہو کر ان کے حامی بن گئے۔ اس لئے کسی بھی سلطنت کی بقا کا دارومدار اس کی عصبیت کی قوت یا کمزوری پر منحصر ہے۔ ہر سلطنت کا زوال اسی وقت ہوا ہے جب اس کی عصبیت کمزور ہو گئی جیسے عباسیہ، علویہ، اور بنو حمدان۔

اگر قبیلہ کی عصبیت طاقتور ہوتی ہے تو وہ فاتح ہو کر سلطنت پر قبضہ کر لیتا ہے۔ اور دشمن کا قائم مقام بن جاتا ہے۔ سلطنت پر قبضہ کے بعد وہ متمدن زندگی اختیار کر لیتا ہے اور آہستہ آہستہ آرام و آسائش و عیاشی کا دلدادہ ہو جاتا ہے۔ اس کی بدویانہ زندگی اور سادگی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے حسب و نسب میں ملاوٹ آ جاتی ہے تمدن زندگی کے زیر اثر شہر بستے ہیں۔ شہر اپنے ساتھ ضروریاتِ زندگی کی فراوانی لاتے ہیں۔ آئین و قوانین شہریوں کو بزدل و پست ہمت بناتے ہیں اور یہی عوامل انہیں بالآخر زوال کی جانب لے جاتے ہیں۔ ابن خلدون ان عوامل کی خاص طور سے نشاندہی کرتا ہے

جو عصبیت کی کمزوری کا باعث ہوتے ہیں۔

۱۔ ابتداء میں عصبیت کی اس قدر قوت ہوتی ہے کہ وہ اقتدار کے تحفظ کی خاطر، حکمراں اور حکومت کی خاطر جان لڑا دیتے ہیں۔ لیکن جب شخصی حکومت تمام اقتدار کو اپنی ذات میں سمیٹ لیتی ہے تو ان میں ذلت و غلامی سرایت کر جاتی ہے اور آنیوالی نسلیں اس غلامی کے ماحول میں پرورش پاکر بزدل بن جاتی ہیں۔

۲۔ متمدن حکومتوں میں قبیلہ کو ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ ٹیکس ادا کرنا باعث ذلت ہوتا ہے اس لئے اس کی عصبیت کمزور ہو جاتی ہے۔ زرعی پیشہ اختیار کرنے سے بھی اس میں غلامانہ اثرات پیدا ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کاشتکاری کی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنی زمین پر رہنا چاہتا ہے جس کے باعث اس کی بدویانہ زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

۳۔ صاحبِ اقتدار طبقہ عیش و آرام کے تکلفات کو روز بروز بڑھاتا ہے۔ ان کی آمدنیاں ان کے مصارف سے قاصر رہتی ہیں۔ لہذا جب حکمراں انہیں مجبور کرتے ہیں کہ وہ جنگی ٹیکس اور جرمانے دیں تو ان کی پوزیشن کمزور ہو جاتی ہے۔

ابن خلدون سلطنت کے قیام میں عصبیت کے کردار کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب کوئی قوم اقتدار حاصل کرتی ہے تو حکومت کے عہدوں پر اپنے ہی لوگوں کو مقرر کرتی ہے۔ لیکن قبیلہ کا ہر خاندان اقتدار میں شرکت نہیں کر سکتا اور صرف چند بارسوخ خاندان اقتدار پر قابض ہو جاتے ہیں۔ لیکن طاقت میں آنے کے بعد اور حکومت

کی مراعات سے فائدہ اٹھاکر جب یہ لوگ عیش و عشرت میں پڑ جاتے ہیں تو حکومت پر بڑھاپا آ جاتا ہے اور ان کی حالت ایسی ہو جاتی ہے جیسے ریشم کا کیڑا اگھر بنا کر مر جاتا ہے۔ اس لئے ایک خاندان کے کمزور ہونے کے بعد دوسرا خاندان جس کی عصبیت طاقتور ہوتی ہے، اقتدار میں آ جاتا ہے۔ اس طرح سے حکومت کچھ عرصہ تک ایک ہی قوم کے مختلف خاندانوں میں رہتی ہے یہاں تک کہ پوری قوم کی عصبیت ختم ہو جاتی ہے۔

عصبیت کی اہمیت کے بعد ابن خلدون سلطنت کے قیام اور اس کے عروج و زوال کے قوانین دریافت کرتا ہے۔ وہ ہر سلطنت کی ابتداء اور بنیاد میں بدوی قبائل کی فتح دیکھتا ہے۔ ہر سلطنت کی ابتداء بدوی قبائل کی فتح سے ہوتی ہے اور اس فتح میں ان کی عصبیت، سادگی، بہادری و شجاعت وہ عوامل ہوتے ہیں جن سے متمدن شہری حکومتیں شکست کھا جاتی ہیں۔

سلطنت کے قیام کے بعد، یہ ایک ہی راستہ پر چلتی ہے اور مختلف ادوار سے گذرتی ہوئی زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ ان ادوار کی نشاندہی ابن خلدون اس طرح سے کرتا ہے:

۱۔ پہلا دور جس میں فاتح قوم اقتدار میں پوری پوری شریک ہوتی ہے اس لئے حکومت کا دفاع بھی سب مل کر کرتے ہیں۔ اس دور میں بادشاہ قوم کے دوسرے افراد سے زیادہ منفرد نہیں ہوتا۔

۲۔ دوسرے دور میں انفرادی و شخصی حکومت پیدا ہوتی ہے۔ اس دور میں بادشاہ اپنے خاص اور پسندیدہ افراد کو اعلیٰ عہدے دیتا ہے، اور ان کی مدد سے اپنے اقتدار کی حفاظت کرتا ہے۔

۳ - تیسرا دور اقتدار کے استحکام کا ہوتا ہے - اس میں بادشاہ کے خلاف مخالفت ختم ہو جاتی ہے - اندرونی و بیرونی خطرات باقی نہیں رہتے - بادشاہ اپنی پوری توجہ ٹیکسوں کی وصول یابی اور آمدنی بڑھانے میں خرچ کرتا ہے، آمدنی کی وجہ سے عظیم الشان عمارتیں بنتی ہیں - وسیع شہر آباد ہوتے ہیں بادشاہ اپنے پسندیدہ امراء اور غلاموں کو مال و دولت و عہدے دیتا ہے - فوج کی تنظیم و اسلحہ کی طرف توجہ دی جاتی ہے۔

۴ - چوتھا دور قناعت پسندی اور صلح جوئی کا ہوتا ہے - اس میں بادشاہ اپنے اسلاف کی حاصل شدہ دولت و عزت پر قناعت کرتا ہے - اسلاف کے نقش قدم پر چلتا ہے اور حکومت کے ڈھانچہ میں کوئی تبدیلی نہیں لاتا -

۵ - پانچواں دور اسراف و فضول خرچی کا ہوتا ہے - اس میں بادشاہ اپنے اسلاف کی دولت عیش و عشرت میں برباد کر دیتا ہے - اپنے خادموں کو بڑے بڑے عہدے دیتا ہے - فوج میں افراتفری پھیل جاتی ہے اور انتظامی ڈھانچہ میں ٹوٹ پھوٹ شروع ہو جاتی ہے اس دور میں حکومت بڑھاپے سے دوچار ہوتی ہے - امراء کے گروہ پر ضعف طاری ہو جاتا ہے - فوج کے مطالبات بڑھ جاتے ہیں - اور صاحب اقتدار طبقہ عیش و عشرت میں ڈوب جاتا ہے۔

تقریباً ہر سلطنت ان ادوار سے گذرتی ہے - اس اصول کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے - تاریخی قوت ختم نہیں ہوتی - انسانیت ایک مقام پر نہیں ٹھہرتی - ایک سلطنت جب ختم ہو جاتی ہے تو اسی مقام سے دوسری سلطنت کی ابتداء ہوتی ہے -

تاریخ اسلام کے مطالعہ کے بعد ابن خلدون اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ نئی سلطنت کا قیام جب ہی ہوتا ہے جب ایک قدیم سلطنت زوال پذیر ہو۔ اگر زوال پذیر قوم پر ' یا ایک ہی قوم کی حکومت ہو تو اس کی فتح آسان ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس میں مختلف اقوام بستی ہوں تو فتح مشکل ہوتی ہے۔ جیسے عربوں نے شام' ایران' عراق' اور مصر کو آسانی سے فتح کرلیا۔ لیکن شمالی افریقہ میں بربری قبائل کی عصبیت کی وجہ سے اس کی فتح میں مشکلات آئیں۔

بعض سلطنتیں اس قدر مضبوط ہوتی ہیں کہ پہلے ہی حملہ میں انھیں فتح نہیں کیا جا سکتا اور بعض سلطنتیں اس وقت تک مدافعت کرتی ہیں جب تک کہ دارالحکومت فتح نہیں ہو جاتا ہے۔ مرکز کے فتح ہونے کے بعد سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے جیسے تاتاریوں نے بغداد کی فتح کے بعد عباسی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

سلطنت کی بقا' جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے' عصبیت پر ہے لیکن کبھی کبھی عصبیت کی کمزوری کے نتیجہ میں سلطنتیں اپنے دفاع کیلئے غلاموں کی فوج پر اعتماد کرتی ہیں۔ جیسے عباسی حکومت میں عرب عصبیت کی کمزوری نے ترک۔ دیلمی و سلجوقیوں کو موقع دیا کہ وہ عباسی سلطنت کی حفاظت کریں۔ لیکن پھر یہی حکومت پر قابض ہو گئے اور عباسی خلافت برائے نام باقی رہ گئی۔

ابن خلدون اس بات کی نشاندہی بھی کرتا ہے کہ حکومت و سلطنت کی حدود کا تعین اس کی قوت پر ہوتا ہے۔ اگر اس کی حدود اس کی قوت سے زیادہ تجاوز کر جائیں تو پھر ان کی حفاظت کیلئے مزید

فوج اور افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ سلطنت کا یہ پھیلاؤ وسعت ملک کی مدافعت کو کمزور کر دیتا ہے۔ اس لئے جب حکومت پر بڑھاپا طاری ہوتا ہے تو اس کے دور دراز علاقے اس سے علیحدہ ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور صرف مرکز باقی رہتا ہے۔ لیکن آخر میں یہ مرکز بھی ختم ہو جاتا ہے۔

ابن خلدون سلطنت کے زوال کے جو اسباب دریافت کرتا ہے اس میں وہ اسے انسانی زندگی سے مشابہہ قرار دیتا ہے۔ اشخاص کی طرح سلطنت کی عمر بھی تین نسلوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ نسل سے ابن خلدون کی مراد ایک شخص کی اوسط عمر ہے جو چالیس سال ہوتی ہے اس اصول کی وضاحت وہ اس طرح سے کرتا ہے:

۱۔ پہلی نسل بدویت کے زیر اثر جفاکش و بہادر ہوتی ہے سلطنت کے قیام کے بعد اس کے اقتدار میں سب شریک ہوتے ہیں۔

۲۔ دوسری نسل بدویت چھوڑ کر شہریت اختیار کرتی ہے۔ اس کی تنگ دستی خوش حالی میں بدل جاتی ہے اور اقتدار سمٹ کر ایک شخص کی ذات میں جمع ہو جاتا ہے۔

۳۔ تیسری نسل سلطنت کے زیر سایہ ذلت و غلامی کی فضا میں پرورش پاتی ہے۔ اس دور میں عیش و عشرت شباب پر ہوتا ہے یکشدہ اندرونی طور پر ٹکڑے ٹکڑے ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں سلطنت اپنا اندرونی و بیرونی دفاع دوسری قوموں یا غلاموں کی مدد سے کرتی ہے۔

۴۔ چوتھی نسل میں سلطنت پر بڑھاپا چھا جاتا ہے۔ اور وہ

زوال پذیر ہوکر ختم ہو جاتی ہے۔ چونکہ تین نسلوں کی عمر ۱۲۰ سال ہوتی ہے اس لحاظ سے حکومتوں کی عمر بھی اتنی ہی ہوتی ہے سوائے اس کے کہ کوئی خاص حالات ایسے ہو جائیں کہ حکومت تو شکست کیلئے تیار ہے مگر اس کے کوئی دعویدار نہیں۔

ابن خلدون سلطنت کے زوال کے اسباب کے ساتھ ساتھ تمدن کے زوال کے اصول بھی وضع کرتا ہے۔ سلطنت کے قیام کے بعد شہروں کی بنیاد پڑتی ہے اور شہر تمدن کو پیدا کرتے ہیں۔ چونکہ قبیلہ حصولِ سلطنت میں ایک طویل جنگ سے گذرتا ہے اس لئے فتح کے بعد اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ آرام و سکون اور عیش و عشرت سے لطف اندوز ہو۔ اس مرحلہ پر شہروں کی بنیاد پڑتی ہے۔ جب انسان شہروں میں اجتماعی زندگی بسر کرتا ہے تو ابتداء میں پیداوار اور وسائل اس کی ضروریات سے زاید ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ ان کا ایک حصہ خرچ کرتے ہیں اور باقی کا استعمال عیش و عشرت کے کاموں میں آتا ہے۔ لیکن جب شہری آبادی میں اضافہ ہوتا ہے تو انسان کی تمدنی ضروریات بھی بڑھ جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سامان گراں ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ضروریاتِ زندگی کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ کاریگر و صنعت و حرفت کے پیشہ ور لوگ تو دولت مند ہو جاتے ہیں مگر عام فرد ان حالات سے متاثر ہوتا ہے یہی وہ مرحلہ ہے جہاں تمدن بھی سلطنت کی طرح زوال پذیر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

ویکو

ژیام باتستا ویکو (۱۶۶۸ - ۱۷۴۴) نیپلز میں پیدا ہوا ابتدائی عمر ہی سے ویکو کو رومی قانون، یونانی فلسفہ اور تاریخ سے دلچسپی تھی۔ ۱۶۹۹ء میں ویکو نیپلز یونیورسٹی میں پروفیسر ہوا۔ ۱۷۲۵ء میں اس نے اپنی مشہور کتاب "جدید سائنس" (New Science) شائع کی۔ جس میں اس نے فلسفۂ تاریخ پر ایک نئے انداز سے روشنی ڈالی۔ ویکو مغرب کا پہلا فلسفی ہے جس نے فلسفۂ تاریخ کو ایک ضابطے اور ترتیب کے ساتھ پیش کیا۔

تاریخ کو سمجھنے کیلئے ویکو اس اصول کو مدنظر رکھتا ہے کہ جس طرح خالق اپنی مخلوق کو بہتر طریقہ سے سمجھتا ہے اسی طرح قوموں کی تاریخ جسے انسان نے بنایا ہے۔ اسے انسان ہی کو بخوبی سمجھنا چاہیئے۔ تاریخ کے مطالعہ سے انسانی ذہن کے ارتقاء اور ترقی کا پتہ چلتا ہے

کیونکہ تاریخ میں وہ تمام درجے اور مراحل ہیں جن سے انسان مختلف زمانوں اور ادوار میں گذرا ہے اور مختلف ذریعوں اور طریقوں سے اس نے اپنی شخصیت اور کردار کو ظاہر کیا ہے۔ اس لئے انسانی ذہن کو سمجھنے کیلئے تاریخ سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں۔ کیونکہ تاریخ ہی اس حقیقت کا اظہار کرتی ہے کہ انسانی ذہن میں کس قدر تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے اور وہ کبھی بھی جامد و ساکت نہیں رہا ہے۔ ابتداء میں اس کے سوچنے کا انداز شاعرانہ تھا۔ بعد میں اس کا انداز مفکرانہ ہو گیا۔ اس لئے تاریخ انسانی ذہن کی تبدیلیوں کا مطالعہ ہے۔

ویکو کی نظر میں ماہر لسانیات، جس میں قواعد داں، مورخ اور نقاد آتے ہیں، صحیح معنوں میں تہذیب و تمدن کے ارتقاء اور ترقی کو دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ کیونکہ فلسفی صرف دلیل کے ذریعے حقیقت کو تلاش کرتے ہیں جب کہ ماہر لسانیات، انسانی خواہشات و جذبات اور ان کی طاقت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جس سے یقینی چیز کا شعور بیدار ہوتا ہے۔ اس لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ فلسفی اور ماہر لسانیات دونوں اپنے طریقوں کو متحد کریں اور پھر حقیقت کو اس کے صحیح روپ میں پیش کریں۔

ویکو کے نزدیک انسانی تاریخ کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ سیاست، زبان، اور قانون کی ابتداء اور ارتقاء کا مطالعہ کیا جائے اور مورخ اپنے تخیل، تحقیق و تنقید کی مدد سے ارتقاء کے مختلف مراحل کو سمجھے اور اسی ترتیب سے تاریخ کی تعمیر کرے۔ ویکو کی کتاب "جدید سائنس" میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ قوموں کی فطرت کو سمجھتے ہوئے

تاریخ کی پیچیدگیوں میں ربط ضبط اور سلسلہ ڈھونڈا جائے تاکہ اس کے ذریعے ماضی و حال اور مستقبل میں رشتہ قائم ہو۔

ویکو انسانی تاریخ میں جب معاشرے کے ارتقاء پر بحث کرتا ہے تو وہ معاشرے کو تین ادوار میں تقسیم کرتا ہے:

پہلا دور: دیوتاؤں کا۔ اس میں انسان فطرت اور اس کے مظاہر سے مرعوب ہوتا ہے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ دیوتا اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس دور میں پیشین گوئی کرنیوالے پجاری معاشرے کی ہدایت کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔

دوسرا دور: سورماؤں کا ہوتا ہے۔ اس دور میں طاقتور، بہادر اور عظیم انسان اپنی صفات کی بنا پر عوام پر حکومت کرتے ہیں۔

تیسرا دور: عوامی ہوتا ہے۔ اس دور میں معاشرے میں مساوات قائم ہوتی ہے۔ اور عوامی حکومت تشکیل پاتی ہے۔

ویکو ان تین ادوار کی تشریح کرتے ہوئے ان کی ذہنی و شعوری خصوصیات بتاتا ہے۔ پہلے دور کی خصوصیات مذہبی ہوتی ہے۔ اس دور کی فطرت و ماہیت شاعرانہ ہوتی ہے۔ اس تصور و تخیل کی مدد سے تخلیق کی جاتی ہے۔ اور تخیل کے سہارے فطرت کے مظاہر کو خدا کی ذات سے ملایا جاتا ہے۔ اپنے اسی تخیل کی وجہ سے وہ ان دیوتاؤں سے خوفزدہ ہوتا ہے جسے اس نے خود تخلیق کیا ہوتا ہے۔

دوسرے دور کی خصوصیات افسانوی ہوتی ہے۔ اس میں سورما اپنے آپ کو خدا کی اولاد بتاتے ہیں اور معاشرے میں اہم و ممتاز مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ اور اسی رشتہ کی بنا پر دوسرے لوگوں پر حکومت کرتے ہیں۔

تیسرے دور کی خصوصیت عقلیت ہے۔ اس میں انسان ذہنی شعور کے لحاظ سے برابر ہو جاتے ہیں۔ اور معاشرے میں قانون کی بالادستی قائم ہو جاتی ہے۔

ویکو زبان، قانون اور حکومت کو بھی تین ادوار میں تقسیم کرتا ہے مثلاً: زبان میں پہلا دور جب آدمی اشاروں اور جسم کی حرکتوں سے اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا۔ دوسرے دور میں نشانات، علامات اور تصویروں کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگا۔ تیسرے دور میں عوامی زبان بنی جس میں الفاظ تشکیل ہوئے اور سب نے انھیں تسلیم کیا۔

قانون کے پہلے دور میں مذہبی قوانین ہوتے ہیں جو معاشرے کو خدا کی جانب سے دئے جاتے ہیں جیسے موسیٰ کے قوانین۔ ان کی تشریح اور نفاذ کیلئے مذہبی پجاری ہوتے ہیں۔ دوسرے دور میں سورماؤں کے بنائے ہوئے قوانین ہوتے ہیں جیسے لکرگس کا قانون۔ تیسرے دور میں عوامی قانون ہوتے ہیں جو عوامی حکومتوں میں نافذ ہوتے ہیں ان قوانین کی بنیاد فطری مساوات پر ہوتی ہے۔

حکومت اپنے پہلے دور میں مذہبی ہوتی ہے۔ اس میں حکمراں کے نمائندے اس کی آواز ہوتے ہیں۔ دوسرے دور میں افراد اشرافیت قائم کرتے ہیں۔ جس میں تمام اختیارات افراد کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ حکومت کا تیسرا دور عوامی ہوتا ہے۔ اس میں قانون کی نظر میں سب برابر ہوتے ہیں۔ اس دور میں وہ بادشاہتیں اور جمہوریتیں آجاتے ہیں جن میں قانون کی بالادستی رہتی ہے۔ اور ہر شہری کو برابر کا درجہ دیا جاتا ہے۔
ویکو اس تمام عمل کو تاریخی چکر (Historical Cycle)

کہتا ہے۔ وہ اس اصول کو تسلیم کرتا ہے کہ " تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے" یہ اس کی اصطلاح میں (Ricorsi) یا " تاریخی واپسی" کا عمل ہے۔ متعدد سورماؤں کے زمانے میں معاشرہ " غیر مہذب احساسات " سے ابھرتا ہے اور ترقی کر کے ذہن و شعور کی انتہا کو پہونچ جاتا ہے۔ جسے وہ " غیر مہذب غور و فکر " کہتا ہے۔ یہاں پہونچ کر ایک تمدن ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسرا چکر شروع ہوتا ہے پھر معاشرہ مذہبی سورماؤں اور عوامی ادوار سے گذرتا ہے اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس لئے ہر تمدن کی ابتداء، عروج و زوال اس چکر میں آتے ہیں۔ ہر نیا تمدن پہلے سے زیادہ وسیع، ہمہ گیر اور جامع ہوتا ہے۔

ویکو جب انسانی تاریخ میں سیاسی ارتقاء کا ذکر کرتا ہے تو اس میں پہلے مذہبی حکومتیں، پھر اشرافیت، اس کے بعد جمہوریت اور آخر میں بادشاہت آتی ہیں۔ وہ جمہوری طرزِ حکومت کو معاشرے کے لئے مفید نہیں سمجھتا۔ اس کے نزدیک جمہوریت ہمیشہ انتشار پیدا کرتی ہے۔ اس انتشار اور کشمکش کو روکنے کیلئے آمرانہ حکومتیں قائم ہوتی ہیں۔ اس طرح جمہوریت ہمیشہ آمروں کیلئے راستہ ہموار کرتی ہے۔ اس لئے وہ بادشاہت کو بہترین طرزِ حکومت قرار دیتا ہے جس میں معاشرے کو مکمل امن، امان اور حفاظت میسر آتی ہے اور یہ نظام اس کو سیاسی ہنگاموں اور انتشار سے محفوظ رکھتا ہے۔

ویکو آمریت کو معاشرے کیلئے انتہائی ضرر رساں اور نقصان دہ

سمجھتا ہے۔ کیونکہ آمریت کے قائم ہونے کے بعد معاشرہ انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ اخلاقی گراوٹ، عیاشی، آرام، سہل پسندی، مردانہ خصوصیات کا خاتمہ و نسوانی انداز کی مقبولیت، دولت کا ارتکاز اور غریبوں و امیروں میں نفرت و عناد کا پیدا ہونا۔ جب معاشرہ ان حالات سے دوچار ہوتا ہے اور آمرانہ حکومتیں ان حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، تو پھر کوئی طاقتور قوم اسے مفتوح کر لیتی ہے کیونکہ یہ فطرت کا دستور ہے کہ کوئی فاسق و فاجر قوم جو اپنی خواہشات کے تابع ہو، وہ کسی مضبوط اور طاقتور قوم کی غلام بن جاتی ہے۔ اس لئے جو قومیں اپنی حالت بہتر نہیں بنا سکتیں، وہ حکومت کی اہل نہیں ان پر دوسروں کے ذریعہ حکومت کی جاتی ہے۔

جب کوئی قوم مفتوح ہو جاتی ہے تو پھر اس کی ساری ترقی اور نشو و نما رک جاتی ہے۔ جیسے رومی شہنشاہیت غیر مہذب قبائل سے شکست کھانے کے بعد پھر سے غیر مہذب ہو گئی۔ جب ان کے یہاں تمدن کی ابتداء ہوئی تو پہلے مذہبی حکومت قائم ہوئی، جو یورپ کا تاریک دور تھا۔ صلیبی جنگوں نے سورماؤں کے دور کی ابتداء کی اور پھر عوامی حکومتیں قائم ہوئیں۔ ویکو کے ہاں یہ "تاریخی واپسی" کا عمل ہے۔

ویکو کے نزدیک آدمی کی پسند فطرت کے لحاظ سے بڑی محدود اور غیر یقینی ہوتی ہے۔ اس کو یقینی بنانے کے لئے عقل سلیم، انسانی ضروریات اور فائدے ہوتے ہیں۔ ضروریات اور فوائد کی بنیاد پر قوموں کے فطری قوانین بنتے ہیں۔ اس لئے تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک ہی قسم کے خیالات و افکار و طریقۂ زندگی اور نظامِ حیات

مختلف قوموں میں پیدا ہوئے جو ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ خیالات و افکار آفاقی ہیں اور ان کی بنیاد حق و سچائی پر ہے۔ اس سے اس غلطی کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے کہ قوموں کے فطری قوانین ایک قوم میں پیدا ہوئے اور وہاں سے دوسری قوموں نے انہیں اپنایا۔ اس غلط خیال کو پیدا کرنے والے مصری اور ایرانی تھے۔ جن کا دعویٰ تھا کہ دنیا میں تہذیب پھیلانے والے وہ ہیں۔ اس سے یہ غلطی پیدا ہوئی کہ "بارہ تختیوں والے قوانین" یونان سے روم آئے۔ حالانکہ مذہبی قوانین ہر قوم اور معاشرہ اپنی روایات و عقائد کی روشنی میں خود بناتا ہے۔ جس کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ دیوانی قوانین ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکتے ہیں، لیکن "قوموں کے فطری قوانین" (Natural laws of Nations) مختلف قوموں میں علیحدہ علیحدہ پیدا ہوئے اور بعد میں یہ قوانین جنگوں سفارتی تعلقات، معاہدوں اور تجارت کے ذریعہ مقبول ہوئے۔

جب آدمی فطرت کے قوانین اور واقعات کی وجوہات سے ناواقف تھا تو اس کیلئے یہ تمام کائنات سربستہ راز تھی۔ اس وقت وہ اپنے ذہن سے واقعات کی وجوہات پیدا کر لیتا تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ چونکہ انسانی ذہن غور و فکر کی صلاحیت رکھتا ہے اس لئے جب وہ کسی چیز کو نہیں سمجھتا تو اس کے باوجود وہ کوئی رائے قائم کر لیتا ہے۔ مثلاً: علم طبیعات جاہلوں میں مابعد الطبیعات کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور وہ تمام راز اور واقعات جو اس کی فہم سے بالاتر ہوتے ہیں انہیں خدا کی مرضی قرار دیتا ہے،

یہ سوچے بغیر کے خدا کی مرضی کیا ہوتی ہے؟ اور کس طرح عمل میں آتی ہے؟

اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ انسانی تصور طاقت ور ہے اور دلیل کر رہے کیونکہ شاعری اپنے زورِ بیان اور تخیلاتی بلندی سے بے جان اشیاء میں جان ڈال دیتی ہے۔ اس کو اس طرح سے بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جب بچے بے جان کھلونوں سے کھیلتے ہیں تو ان کو زندہ تصور کر لیتے ہیں۔ اس اصول پر فرضی و بے بنیاد قصے کہانیاں لوگوں میں حقیقت بن جاتی ہیں۔

ویکو کی نظر میں الفاظ وہ ذریعہ ہیں جن سے انسانی ذہن اور روح کے خیالات ظاہر ہوتے ہیں۔ علم صرف کے اس اصول سے اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ انسانی ذہن کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ، زبان کے معنی و اظہار میں بھی تبدیلی آتی چلی گئی۔ مثلاً اطالوی زبان کی ابتداء بڑی کھردری تھی۔ ابتداء میں "Lex" کے معنی گھونگے جمع کرتے کے تھے پھر یہ لفظ "Luex" بنا، جس کے معنی شاہ بلوط کے درخت کے ہوئے اس کے بعد تبدیل ہو کر پھر یہ "Lex" بنا جس کے معنی اجتماع یا پارلیمنٹ کے ہوئے۔

اسی طرح ابتداء میں انسانی فطرت خام، کھردری، اور بھونڈی تھی۔ پھر ذرا سخت ہوئی۔ اس کے بعد خوشگوار، نازک، حساس، اور آخر میں ہرجائی اور آوارہ۔ جیسے ابتداء میں عظیم انسان پیدا ہوئے جیسے سائیکلوپ (Cyclope) پھر عالی ظرف اور بلند حوصلہ جیسے اکیلیز (Achilles) پھر خطیب و انصاف پسند جیسے سسپیو افریکانس (Sicipo Africanus) اور ارسٹائڈ

(Aristide) پھر بلند ہستیاں جن میں نیکی و بدی دونوں شامل تھیں جیسے: سکندر اور سیزر۔ آخر میں مایوس و دل شکستہ انسان جیسے تبریس (Tiberius) اور سب سے آخر میں آوارہ اور بدچلن جیسے کالی گولا (Caligula) اور نیرو (Nero)

ویکو تاریخ میں کچھ ایسے کلی و اصلی اصول دریافت کرتا ہے جن پر تمام قوموں اور معاشروں کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً تمام مہذب و غیر مہذب قوموں میں تین روایتیں عام نظر آتی ہیں: (۱) مذہبی طریقہ پر زندگی گذارنا (۲) شادی بیاہ کی رسومات (۳) اور مردہ کو دفن کرنا۔ کوئی قوم کسی قدر جاہل اور غیر مہذب ہو ان کے ہاں یہ تین روایات عام تھیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ ایک ہی قسم کی روایات پر ہر قوم کی تہذیب شروع ہوئی

ویکو آدمی کو فطری طور پر خود غرض بتاتا ہے۔ اس لئے خود غرضی کی بنا پر انسان ہر کام اور ہر عمل میں اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔ اس لئے یہ جذبہ اس پر قابو پا لیتا ہے۔ وہ اپنے جذبات کو انصاف کیلئے استعمال نہیں کرتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ انسان میں حیوانی جذبات غالب ہیں اور وہ اپنے فائدے کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتا۔ لیکن جب انسان معاشرے کے بندھنوں میں بندھتا ہے تو پھر اس کے جذبات میں تبدیلی آتی ہے۔ شادی کے بعد جب اس کی خاندانی زندگی شروع ہوتی ہے تو وہ اپنی اور اپنے خاندان کی بہتری چاہتا ہے۔ جب وہ شہری زندگی اختیار کرتا ہے تو اپنے اور شہر کے فائدہ کا

خواہشمند ہوتا ہے۔ پھر اس کا دائرہ دلچسپی بڑھتا ہے اور وہ اپنے ساتھ قوم کی فلاح چاہتا ہے۔ جب قومیں جنگوں، سماجوں اور مسلح امن کے بندھنوں میں جکڑ کر ختم ہو جاتی ہیں تو اس وقت وہ اپنے فائدے کے ساتھ ساتھ پوری انسانیت کا فائدہ چاہتا ہے۔ لیکن ان تمام مراحل میں انسان بنیادی طور پر اپنے فائدے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ اس لئے صرف مافوق الفطرت طاقت واثر سے اسے مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے خاندان، ریاست، اور انسانیت سے انصاف کرے۔ جو چیز انسانوں میں انصاف قائم رکھ سکتی ہے وہ ایسی انصاف ہے جو خدا کی جانب سے قائم ہوتا ہے اور وہ معاشرے میں امن وامان برقرار رکھتا ہے۔

کانٹ

ایمانوئل کانٹ ۱۷۲۴ء میں کونگز برگ کے مقام پر پیدا ہوا۔ اور اسی شہر کی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کے بعد ذریعہ معاش کے طور پر اعلیٰ خاندانوں میں ٹیوشنیں پڑھائیں۔ ۱۷۷۰ء میں اس کا کونگز برگ یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر کے تقرر ہوا جہاں اس نے فلسفہ، منطق، جغرافیہ، ریاضی، طبیعات اور دوسرے علوم پر لیکچر دیئے۔ ۱۷۸۴ء میں کانٹ نے تاریخ پر ایک مضمون لکھا، جس میں اس نے اس نظریہ کو پیش کیا کہ آفاقی تاریخ کن اصولوں پر لکھی جانی چاہئیے۔ یہ مضمون خیالات کی جدت اور فکر کی گہرائی کے لحاظ سے انتہائی اہم ہے۔ ۱۸۰۴ء میں کانٹ کی وفات ہوئی۔

تاریخ قوانین کے دائرے میں عمل پذیر ہے۔ اور انسان ان قوانین کے تحت فطرت کے سوچے سمجھے اور متعین منصوبے کو بغیر سوچے سمجھے

پورا کر رہا ہے۔ تاریخ کے ان قوانین کے پس منظر میں فطرت اپنی تمام قوتوں کے ساتھ موجود ہے اور انسان کو برابر آگے کی جانب دھکیل رہی ہے اور وہ لاشعوری طور پر اس کے تمام منصوبوں کی تکمیل کر رہا ہے۔ اس لئے تاریخ کا موضوع "فطرت کے منصوبے ہیں"۔ سائنسدان جب فطرت اور اس کے قوانین کا مطالعہ کرتا ہے اور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے فطرت کے قوانین کو دریافت کر لیا ہے تو اس کا یہ مطلب یہ نہیں ہوتا کہ فطرت کوئی قانون داں ہے جو قانون بناتی ہے، بلکہ اس قانون سے مراد فطرت کی ترتیب و تنظیم اور تدوین ہے۔ اس لئے مورخ جب فطرت کے منصوبوں کی بات کرتا ہے تو اس کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ فطرت کسی دماغ، ذہن یا شعور کے ساتھ کوئی منصوبہ بناتی ہے اور پھر وہ منصوبہ تاریخی عمل میں پورا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخی عمل ان منصوبوں پر اس طرح عمل کرتا ہے جیسے وہ کسی کے ذہن کے اشاروں پر چل رہا ہے۔

کانٹ تاریخ اور فطرت کے رشتے کو مستحکم رکھتا ہے کیونکہ اس نے تاریخی شعور کو ایک نئی فکر دی ہے۔ وہ اس روایتی خیال سے اختلاف کرتا ہے کہ انسان خدا کے منصوبوں کی تکمیل کرتا ہے اور یہ کہ انسان محض ایک آلۂ کار ہے۔ اور وہ ایک اعلیٰ ہستی کی راہنمائی میں اس کے مقاصد کو پورا کر رہا ہے۔ کانٹ کے اس نظریہ نے تاریخی شعور میں زبردست تبدیلی کی۔ اس نے اس نہج پر آفاقی تاریخ کی بنیاد رکھی جس سے انسان کے اعمال، اس کی ترقی اور فطرت کے منصوبوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

کانٹ کے نزدیک فطرت کا مقصد مخلوق کی تشکیل سے یہ ہے کہ اس

کا وجود برقرار رہے۔ اور اس کی صلاحیتوں اور جوہر کی تکمیل ہو فطرت کی تبدیلی داخلی ہوتی ہے خارجی نہیں۔ اس نے گھاس کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ اسے گائے کھائے یا گائے کو آدمی کھائے۔ بلکہ گھاس اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ گھاس ہونی چاہیئے۔

انسان کا جوہر اس کی عقل وفہم اور ادراک ہے۔ اس لئے فطرت نے انسان کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ عقل کا پابند رہے۔ عقل وفہم اور ادراک کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ انسان کی زندگی میں تکمیل کو نہیں پہونچتی۔ مثلاً: ایک شخص تمام علم ریاضی تخلیق نہیں کر سکتا بلکہ وہ اس علم سے فائدہ اٹھاتا ہے جو اس سے پہلے لوگ چھوڑ گئے اس لئے انسانی عقل وفہم کا نشو ونما انفرادی زندگی میں نہیں بلکہ تاریخی عمل میں پورا ہوتا ہے۔ انسان چونکہ عقل وفہم کا مالک ہے اس لئے اس کی صلاحیتیں بروئے کار لانے کیلئے تاریخی عمل ضروری ہے۔ یہ تاریخی عمل عقل وادراک کو ترقی دیتا ہے اس لئے انسانی تاریخ عقل، فہم اور ادراک کی تاریخ ہے۔

تاریخ اور فطرت کے اس رشتہ اور تاریخی عمل میں فطری قوتوں کے اثر کو ذہن میں رکھتے ہوئے، کانٹ نے آفاقی تاریخ کے اصول ترتیب دیئے ہیں جن پر انسانی تاریخ گردش کر رہی ہے:

اول: فطرت نے اپنی مخلوق میں جو صلاحیتیں پیدا کی ہیں انہیں ظاہر ہونا چاہیئے۔ جو انسانی عضو استعمال نہیں ہوتا یا اسے مقصد کیلئے بروئے عمل نہیں لایا جاتا تو یہ فطرت کے خلاف ہوتا ہے۔ اگر ہم اس نظریہ سے اختلاف کریں تو فطرت ایک ایسی شے کے

طور پر ظاہر ہوتی ہے جو بغیر کسی مقصد کے متحرک ہے اور اس میں کوئی صلاحیت نہیں کہ وہ کسی قانون کو بنائے اور اس پر عمل کرائے۔ اس صورت میں فطرت کے اندر "چانس" کا افسردہ اندھیرا ہے۔ فہم و ادراک کی روشنی نہیں۔

دوم: انسان جو فہم و ادراک کا مالک ہے اس میں فطری صلاحتیں انفرادی طور پر بلکہ مجموعی طور پر پیدا کی گئی ہیں۔ فہم و ادراک کسی جذبہ کے تحت پیدا نہیں ہوتی، یہ تجربات، ہدایات اور ورکش کے بعد داخلی مرحلے سے گذر کر پیدا ہوتی ہے۔ فطرت نے انسان کو زندگی کا تھوڑا وقت دیا ہے۔ اس لئے فہم و ادراک کیلئے اور اس کی ترقی کیلئے نسلوں کی ضرورت ہوتی ہے جو اپنی ذہانت اور تجربات کو دوسروں کے حوالے کرتی رہتی ہیں، یہاں تک کہ اس کی تکمیل ہو جائے۔

سوم: فطرت نے انسان میں حیوانی خواہشات پیدا کی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے فہم و ادراک کی دولت سے مالا مال کیا ہے تاکہ انسان اس کے ذریعہ سے خوشی و مسرت کی تکمیل کرے فطرت اپنے نقطۂ نظر سے کوئی بیکار کام نہیں کرتی اور اپنے مقاصد کو پورا کرنے کیلئے ذرائع دریافت کرتی رہتی ہے۔ جب انسان کو اپنے ادراک اور اس کے استعمال کی آزادی دیدی گئی تو اپنی خواہشات کا تابع نہیں رہا اور نہ ہی علم لدنی کو اس نے اپنا راہنما بنایا۔ وہ ہر شے خود تخلیق کرتا ہے اور خود ہی اسے اپنی حفاظت اور تباہی کیلئے استعمال کرتا ہے فطرت نے اسے نہ تو سینگ دیئے ہیں اور نہ پنجے کہ ان

کے ذریعے اپنی حفاظت کرے، اور نہ اس میں خوشی و مسرت کا جذبہ پیدا کیا کہ زندگی پر سکون رہے۔ اس کی فہم، دوررسی، احتیاط اور نیکی اس کی اپنی خواہش کی پیداوار ہیں۔ فطرت نے اس معاملہ میں انتہائی تحمل سے کام لیا ہے تاکہ انسان ابتدائی زندگی سے لے کر آخر تک فہم و ادراک کی تکمیل میں اپنی تمام صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لائے۔ اب تک انسان نے جو ترقی کی ہے، اس کا انحصار اس کی اپنی انہیں صلاحیتوں پر ہے۔

فطرت نے انسان کی بہبود سے زیادہ اس کی عقل کو اہمیت دی ہے۔ اس لئے اسے زندگی میں تلخ اور تکلیف دہ جدوجہد اور کوشش سے واسطہ پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ فطرت کے اصول کے خلاف ہے کہ انسان آرام و سکون اور اطمینان کی زندگی گزارے۔ انسانی معاشرہ جب تک تاریخی گمنامی میں ہوتا ہے وہ ایک جگہ جامد و ساکت رہتا ہے اور فطری قوانین پر عمل کرتے ہوئے آرام و سکون کی زندگی گزار دیتا ہے۔ لیکن فطرت کے قوانین اسے اس طرح خاموش اور بے عمل نہیں دیکھ سکتے اور اسے مجبور کرتے ہیں کہ زندگی کو بہتر بنانے کے لئے جدوجہد کرے۔ اس سلسلہ میں تعجب خیز بات یہ ہے کہ ہر انسانی نسل تھکا دینے والی محنت و مشقت اس لئے کرتی ہے کہ آنے والوں کو فائدہ ہو۔ اور آنے والی نسل اس مشقت کے ذریعے فطرت کے منصوبوں کو ایک منزل اور آگے لے جاتی ہے۔ اب یہ آخری نسل کی خوش نصیبی ہوگی کہ وہ اس عمارت میں رہے گی جسے ہزارہا نسلوں نے قربانیوں کے بعد تعمیر کیا ہے۔ اس تعمیر میں

ان کا وہ جذبہ بھی شامل تھا کہ وہ اس سے بہرہ ور نہیں ہو سکیں گے اس سے یہ ثابت ہوا کہ انسان انفرادی طور پر فانی ہے اور مجموعی طور پر غیر فانی۔ اور فطرت نے اسے یہ موقع دیا کہ وہ مجموعی طور پر اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح مکمل کرے۔

چہارم: فطرت انسان کو غیر متحرک اور ساکت نہیں رہنے دیتی اور وہ آپس کے اختلافات سے انسان کی صلاحیتوں کو ابھارتی اور ان کی پرورش کرتی ہے۔ اس اختلاف سے مراد ان کی غیر سماجی سرگرمیاں اور فطری برائیاں ہیں جو انسانی معاشرے کو برابر تباہ و برباد کرنے کی دھمکی دیتی رہتی ہیں۔ ایک طرف تو انسان میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ آپس میں مل جل کر رہیں تو دوسری طرف سے اس میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسروں سے علیحدہ رہے کیونکہ وہ اپنے فائدے کو انفرادی اور ذاتی نقطۂ نظر سے سوچتا ہے۔ اپنی ذاتی خواہشات کو پورا کرنے میں اسے مخالفت سے دو چار ہونا پڑتا ہے اور وہ اس مخالفت کا جواب مخالفت سے دیتا ہے۔ یہ مزاحمت اور مخالفت انسان کی صلاحیتوں کو بیدار کرتی ہے اور اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنی عزت، خلعت، دولت، طاقت اور رتبہ کیلئے جدوجہد کرے۔ اس جدوجہد کے نتیجہ میں صلاحیتیں ارتقائی طور پر ترقی کرتی ہیں اور اس کی وجہ سے تہذیب و تمدن اور ثقافت کی تخلیق ہوتی ہے۔ اسی سے فکر میں پختگی آتی ہے اور اسی سے اقدار و روایات بنتی ہیں۔

ان صلاحیتوں کو بروئے کار لائے بغیر جو انسان کی خودغرضانہ

ذہنیت کی پیداوار ہیں؟ معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔ ایک شخص چرواہا بن کر خاموش اور پر امن زندگی گذار سکتا ہے لیکن اس صورت میں اس کی تمام صلاحیتیں اس میں پنہاں اور پوشیدہ رہ کر ختم ہو جائیں گی اور ایسا شخص اعلیٰ مقصد کیلئے کچھ نہیں کر سکے گا۔ اس لئے فطرت کا شکر گذار ہونا چاہیئے کہ اس نے انسان میں حسد، بغض، رشک، فخر و غرور اور طاقت و اقتدار کی ہوس پیدا کر دی ہے ورنہ ان جذبات و خواہشات کے بغیر انسان کی تمام صلاحیتیں ہمیشہ کیلئے گہری نیند سو جاتیں اور انسانی زندگی بغیر کسی ترقی کے ختم ہو جاتی۔

انسان امن و سکون چاہتا ہے لیکن فطرت اس راز سے واقف ہوتے ہوئے کہ اس کی بہتری کیلئے کیا ضروری ہے، فساد اور جھگڑے پیدا کرتی ہے۔ وہ خواہش کرتا ہے کہ آرام و اطمینان سے رہے لیکن فطرت اسے آرام سے نکال کر دکھ، تکلیف، مصیبت اور پریشانی میں ڈال دیتی ہے تاکہ اس کی صلاحیتیں ابھریں اور وہ ان سے چھٹکارہ پانے کیلئے برابر جد و جہد کرتا رہے۔ فطرت انسان کی خواہش و حسرت کی کوئی پرواہ نہیں کرتی۔ اس نے انسان میں یہ جذبہ پیدا کر دیا ہے کہ وہ اپنی حسرت کو بھی قربان کر دے اور دوسروں کی خوشیوں کو بھی چھین لے۔ اس منصوبے پر وہ اندھا بن کر عمل کرتا ہے اور فطرت کا آلۂ کار بن جاتا ہے۔ انسانی تاریخ کے مظاہر حماقتیں، لالچ، ظلم، درندگی، اور ہوسناکی ہیں۔ اور اس کی ترقی کی وجہ اس کی خواہشات، جہالت اور اخلاقی کمزوریاں ہیں۔

پنجم: انسانی نسل کا سب سے بڑا مسئلہ جس کے حل کیلئے فطرت اسے مجبور کرتی ہے وہ ایک ایسے معاشرہ کا قیام ہے جو آفاقی قدروں اور قوانین پر ہو اور جس میں صحیح آزادی کا استعمال ہو، ایک فرد دوسرے کو ختم نہ کرے اور فطرت انسان میں جن صلاحیتوں کو ابھارنا چاہتی ہے ان کا نشوونما ہو سکے اور نسل انسانی ان صلاحیتوں کے ذریعے فطرت کے تقاضوں کی تکمیل کر سکے۔

فطرت انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ مکمل آزادی کے بجائے پابند اور محدود آزادی کو پسند کرے۔ جب انسان اپنی ضرورت کے تحت ایک دوسرے سے مل جل کر رہتا ہے تو وہ غیر قانونی اور لامحدود آزادی کو چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس جذبہ سے چھٹکارا نہیں پاتا کہ دوسروں کی آزادی میں دخل اندازی نہ کرے اور انہیں اس سے محروم کر کے خود تنہا فیضیاب نہ ہو۔ لیکن ان رجحانات کی وجہ سے معاشرے میں اچھے نتائج پیدا ہوتے ہیں اس طرح جیسے جنگل میں ہر درخت یہ کوشش کرتا ہے کہ دوسرے درخت کو ہوا اور سورج کی روشنی سے محروم کر دے۔ اس کوشش میں وہ برابر بلند ہوتے چلے جاتے ہیں اور یہ بلندی انہیں خوبصورتی و شوکت ادا کرتی ہے۔ لیکن جو درخت جنگل سے دور تنہا علیحدہ اور آزاد پیدا ہوتا ہے، اس کی شاخیں بے تکی اور نیچے کی طرف پھیلتی ہیں اس لئے ان میں نہ تو خوبصورتی ہوتی ہے اور نہ بلندی۔

ششم: انسان جب اجتماعی زندگی گزارتا ہے تو اسے

ایک سربراہ کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی سرگرمیوں اور حرکات پر نظر رکھے۔ اور اسے اس بات کا موقع نہ دے کہ وہ دوسروں کی آزادی ختم کر کے اپنی آزادی کو ناجائز طور پر استعمال کرے۔ اس مقصد کیلئے قانون کی ضرورت ہوتی ہے جو انسان کی آزادی پر پابندی لگائے۔ لیکن ان تمام پابندیوں کے باوجود اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ انھیں توڑے۔ اس لئے سربراہ یا اعلیٰ طاقت اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنی ذاتی خواہش کو آفاقی خواہش میں تبدیل کر دے۔ چونکہ سربراہ یا اعلیٰ طاقت کا حامل بھی انسان ہی ہوتا ہے اس لئے اسے بھی ایک اور اعلیٰ ہستی کی ضرورت ہوتی ہے کہ جس اشارہ حق و انصاف سے کام کر سکے۔ یہ انسانی تاریخ کا ایک اہم مسئلہ ہے اور اس کا اب تک کوئی مکمل حل دریافت نہیں ہوا۔

ہفتم: دنیا میں امن و امان برقرار رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ ریاستوں کے آپس میں قانونی تعلقات ہوں۔ جس طرح انفرادی طور پر غیر سماجی سرگرمیاں انسان کو ترقی پر مجبور کرتی ہیں۔ اسی طرح ہر ریاست ایک دوسرے کے ڈر اور خوف سے بہتر تعلقات کی خواہش مند ہوتی ہے اور باہمی خوف کی وجہ سے ایک دوسرے کی حفاظت کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہر ریاست ایک نہ ختم ہونیوالی جنگ کی تیاریوں میں مصروف رہتی ہے اور زمانہ امن میں بھی وہ اپنے مقصد کیلئے جبر و جبر کرتی رہتی ہے۔ تباہی، انقلاب اور داخلی خلفشار کے باعث ایک ریاست دوسری ریاست پر قابو پالیتی ہے۔ اس لئے

چھوٹی ریاستوں کی حفاظت بین الاقوامی فیڈریشن پر مبنی ہے یہ خیال اگرچہ اس وقت محض ایک خواب اور تخیل معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ اسی طرح ممکن ہے جیسے ابتدائی زندگی میں انسان نے اپنی لامحدود آزادی کو حفاظت و آرام کی خاطر قربان کر دیا تھا۔ اسی طرح ریاستیں امن و سکون کی خاطر ایک دوسرے سے مل کر رہنا پسند کریں گی.

تمام جنگیں انسان کے ارادے سے نہیں ہوتیں، بلکہ یہ فطرت کے مقصد کو پورا کرنے کیلئے ہوتی ہیں تاکہ قوموں میں نئے تعلقات پیدا ہوں اور اس تباہی و بربادی سے نئے سیاسی نظام کی تشکیل ہو۔ کوئی بھی سیاسی نظام ہمیشہ کیلئے نہیں ہوتا اسے بھی وقت کے ایک حصے میں انقلاب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ شکست و ریخت اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ ایک ایسا نظام نہیں آجاتا جسے مکمل کہا جائے.

ہشتم: نسل انسانی کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فطرت کے چھپے ہوئے منصوبوں کی تکمیل کر رہی ہے۔ انسان سیاسی دستور اور ریاست کو اس شکل میں تخلیق کرتا ہے تاکہ فطرت نے اسے صلاحیتیں دی ہیں وہ پوری طرح بروئے کار آسکیں اور ان کی نشوونما و ترقی ہو سکے۔

ریاستیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ صنعتی و تجارتی تعلقات انھیں ایک دوسرے کے اور قریب لے آتے ہیں۔ اگر ان تعلقات میں کوئی رکاوٹ ہوتی ہے تو اس سے تمام ریاستیں متاثر ہوتی ہیں اگرچہ آجکل کے حکمران عوامی بہبود کیلئے کچھ نہیں کرتے

اور اپنے تمام ذرائع کو جنگ کی تیاریوں میں استعمال کرتے ہیں لیکن اگر عوام خود اپنی بہتری کیلئے جدوجہد کریں تو یہ حکمران ایسے روک بھی نہیں سکتے ۔ جنگ کی صورت میں دوسری ریاستیں جو تجارتی و صنعتی رشتوں میں جکڑی ہوئی ہوتی ہیں وہ بھی متاثر ہوتی ہیں ۔ یہ اپنی کوششوں سے، بغیر کسی قانونی مدد کے، اس جنگ کو ختم کرانیکی کوشش کرتی ہیں ۔ اور ثالثی بننے کی پیش کش کرتی ہیں ۔ یہ رجحان ایک ایسے ادارے کی تشکیل کی جانب پہلا قدم ہے جو اقوام عالم کو پر امن زندگی پر مجبور کرے گا ۔ سیاسی انقلابات اور تبدیلیوں کے ذریعے فطرت اپنے منصوبوں کو مکمل کرے گی اور اس آفاقی ادارے کی سربراہی میں انسان اپنی تمام صلاحیتوں کو مکمل طور پر بروئے عمل لائے گا اور یہی اس کی ترقی کی معراج ہوگی ۔

نہم: تاریخ فطرت کے منصوبے کو تکمیل کی جانب لے جا رہی ہے، مثلاً: یونانیوں کے علم کو رومیوں نے محفوظ رکھا، ان سے یہ علم غیر مہذب قبائل نے حاصل کیا اور ان سے یہ یورپ کی موجودہ اقوام تک پہنچا ۔ اس روشنی میں اگر دوسری ریاستوں کی تاریخ کو دیکھا جائے، ان کے قانون کا مطالعہ کیا جائے اور ان کے خارجی تعلقات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جو خوبیاں ہوتی ہیں وہ ایک خاص وقت تک قوم کو منظم و ترقی یافتہ بنانے میں مدد دیتی ہیں ۔ جب ان کی برائیاں وقت کے ساتھ بڑھ جاتی ہیں تو وہ اس نظام کو ختم کر دیتی ہیں ۔ لیکن اس تباہی میں ترقی کی چنگاریاں ہوتی ہیں، اس لئے ہر انقلاب، تبدیلی، تباہی اور ترقی کی علامت ہوتا ہے ۔

ہرڈر

ہرڈر ۱۷۴۴ء میں جرمنی کے ایک چھوٹے سے شہر "مہرنگن" میں پیدا ہوا۔ اعلیٰ تعلیم کونگزبرگ یونیورسٹی میں حاصل کی جہاں اس نے کانٹ کے فلسفہ اور جغرافیہ پر لیکچر سنے اور ان سے بے انتہا متاثر ہوا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد اس نے مختلف ملازمتیں اختیار کیں۔ اسی دوران اس کی ملاقات گوئٹے سے ہوئی۔ گوئٹے نے اسے ۱۷۷۶ء میں وائمر بلالیا۔ ۱۸۰۳ء میں اس کا انتقال ہوا۔

ہرڈر نے فلسفہ، الہیات، ادب، لسانیات اور تاریخ کے موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں۔ ہرڈر پہلا فلسفی ہے جس نے فلسفۂ تاریخ میں اس نظریہ کو پیش کیا کہ انسانی فطرت ایک جیسی نہیں ہے بلکہ مختلف ماحول اور حالات میں یہ فطرت بدلتی رہتی ہے۔

ہرڈر تاریخ کو سمجھنے کیلئے تین چیزوں کو لازمی خیال کرتا ہے " وقت، جگہ اور قومی کردار" ان کو ذہن میں رکھتے ہوئے تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو تاریخ کے پیچیدہ اور الجھے ہوئے سوالات سمجھ میں آسکتے ہیں: کہ سلطنتیں کس طرح پیدا ہوتی ہیں؟ ختم ہوتی ہیں اور پھر دوسری شکل میں نمودار ہوتی ہیں۔ یا یہ کہ ماضی میں کیوں خانہ بدوشوں کے درمیان بابل و نینوا کی تہذیب ابھری؟ اور کس طرح ساحل پر ٹائر (Tyre) آباد ہوا؟ کس طرح افریقہ میں مصر کی تہذیب پروان چڑھی؟ اور کیوں کہ عربی صحرا میں یہودیوں کی ریاست قائم ہوئی؟ درحقیقت ان تمام تاریخی واقعات کے پس منظر میں وقت، جگہ، اور قومی کردار متحرک نظر آتا ہے۔

ہرڈر پہلا مفکر ہے جس نے اس جانب اشارہ کیا کہ انسان چونکہ مختلف نسلوں، اور قبیلوں سے تعلق رکھتا ہے اور ان کے آپس میں لاتعداد اختلافات ہیں، اس لئے انسانی فطرت ایک جیسی نہیں ہوتی بلکہ مختلف ہوتی ہے۔ اس ضمن میں وہ دلیل دیتے ہوئے کہتا ہے کہ چینی تہذیب و تمدن جغرافیائی ماحول اور مخصوص آب وہوا کی وجہ سے وجود میں نہیں آیا بلکہ یہ چینی قوم کی مخصوص فطرت اور مخصوص ذہن کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوا۔ اگر اس جغرافیائی ماحول اور آب وہوا میں کسی دوسری قوم کو رکھا جاتا تو یقیناً وہ اپنے ذہن، کردار، اور اپنی فطرت کے مطابق ان وسائل کو استعمال کر کے بالکل ہی دوسری تہذیب کو جنم دیتی۔ اس لئے تمام سیاسی وسماجی ادارے، روایات تاریخی تجربات سے نہیں بلکہ قوم کی نفسیاتی خصوصیات کے نتیجہ میں وجود میں آتے ہیں۔

ہر نسل اور ہر قوم کی اپنی ایک علیحدہ فطرت اور ذہن ہوتا ہے اور انسان جسمانی لحاظ سے مختلف نسلوں سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس لئے اس کے ذریعہ اس کی عادات، رسومات اور اقدار کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ ہر نسل اپنی مخصوص نفسیاتی خصوصیات کے نتیجہ میں اپنی تہذیب و ثقافت کو پیدا کرتی ہے

چونکہ انسانی فطرت ایک نہیں ہے اس لئے ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ ہر نسل اور ہر قوم کی فطرت کو سمجھا جائے اور اس کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کیا جائے ۔ اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ ہر قوم کی نفسیاتی خصوصیات اس کی فطرت کو ٹھوس بنا دیتی ہیں ۔ اس لئے مورخ کیلئے ضروری ہے کہ ایک عمومی فطرت کے بجائے مخصوص، ٹھوس اور مکمل فطرتوں کا مطالعہ کر کے ان کو دریافت کرے ۔

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ہرڈر کہتا ہے کہ تاریخ میں نسلی جذبہ بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے کیونکہ ہر آدمی کا تعلق کسی نہ کسی نسل سے ہوتا ہے ۔ اس لئے اس کی شکل و صورت، رہن سہن، غور و فکر ۔ ایک ہی طریقہ، ترتیب اور ماحول میں تشکیل ہوتی ہیں ۔ اور انہیں بنیادوں پر "قومی کردار" کی تعمیر ہوتی ہے ۔ کیونکہ اجداد کے طریقے اور روایات گہری جڑ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور پوری نسل کی رگ و پے میں سرایت کر جاتے ہیں ۔ اس سلسلہ میں یہودیوں کی مثال سب سے زیادہ درخشاں ہے ۔ ان کی غور و فکر اور سوچنے کا انداز اور عمل ہر جگہ یکساں رہتا ہے ۔ اگر وہ کسی دوسری نسل سے خلط ملط ہوئے تب بھی ایک عرصہ تک انہوں نے اپنی روایات کو برقرار رکھا ۔ یہی مثال مصری، چینی، عرب اور ہندو قوم پر صادق

آتی ہے۔ جس قدر کوئی قوم علیحدہ رہتی ہے اور اپنے ماحول و روایات کی چار دیواری میں بند رہتی ہے اسی قدر اس کا قومی کردار پختہ ہوتا ہے۔

لیکن انسان درخت کی طرح ایک جگہ مضبوطی سے اپنی جڑیں جمائے ہمیشہ نہیں رہتا۔ بلکہ یہ ایک متحرک اور بے چین شے کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا رہتا ہے۔ فطرت کی سختیاں، قحط، جنگ، وبا اور زلزلہ اسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ دیس دیس پھرے۔ لیکن جب وہ اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر دوسری جگہ جاتا ہے تو اپنے ساتھ اپنی روایات و اقدار کو بھی لے کر جاتا ہے اور سختی سے ان پر کاربند رہتا ہے نئی سرزمین پر پرانے ناموں کو رواج دے کر ماضی سے اور وطن سے اپنا ذہنی تعلق قائم رکھتا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود سرزمین کی آب و ہوا اس کے کردار اور عادت کو متاثر کرتی ہیں جیسے فونیقی بحر احمر سے بحر روم میں منتقل ہوئے اور اسرائیلیوں نے حضرت موسیٰ کی راہنمائی میں وطن چھوڑ کر نئی سرزمین کی تلاش کی۔

تاریخ میں قوموں کا یہ سفر اور ہجرت ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ کوئی قوم اور نسل ایک جگہ مستقل آباد نہیں رہتی۔ وہ ہمیشہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے نسلیں ایک دوسرے سے خلط ملط ہوتی رہتی ہیں۔ اس لئے آج کوئی قوم خود کو خالص نہیں کہہ سکتی ہے۔ قدرت نے انسان کو یہ صلاحیت اور طاقت دی ہے کہ وہ جس جگہ چاہیں پیدا ہوں، جس جگہ چاہیں پروان چڑھیں، اور ترقی کریں۔ اس لئے دنیا کی تمام نسلیں ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

ہر دور سلطنت کی ترقی اور زوال کو بھی وقت اور جگہ سے منسوب کرتا ہے۔ خانہ بدوش قبائل جو اپنی روایات پر قائم رہتے ہیں، ان کے ہاں بادشاہت کی مدت کم ہوتی ہے۔ اگر کوئی سلطنت دورِ شباب میں بڑے شہروں پر قبضہ کرے تو اس کی وسعتِ حکمرانی میں اضافہ ہو جاتا ہے، لیکن اس میں مضبوطی و استحکام پیدا نہیں ہوتا اور ایک بادشاہ کی موت پورے نظام کے خاتمہ کا باعث ہو جاتی ہے۔ یہی بابل، نینوا، اور پرسی پولس کے ساتھ ہوا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک درخت سر اٹھاتا ہے اور پھیلتا ہوا ارد گرد کے علاقہ پر چھا جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کی جڑیں مضبوط نہیں ہوتیں تو ہوا کا ایک طاقتور جھکڑ اسے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ اسی طرح سلطنت کے ایک غلام کی غداری یا گورنر کی بغاوت پر ختم ہو جاتی ہے یعنی مطلق العنان اور مضبوط حکمران تخت و تاج سے محروم ہو جاتے ہیں اور کمزور ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ جیسے بخت نصر، جس سے ایشیا لرزتا تھا، موت کے بعد اس کے جانشینوں نے پوری سلطنت کو تباہ کر دیا۔

ہر دور انسانیت کی تاریخ کو انسان کی طاقت، عمل اور رجحانات کی فطری تاریخ بتاتا ہے جو جگہ اور وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اس لئے تاریخ کے مطالعہ کے بعد بار بار ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ یہ کیوں ہوا؟ اور ایسا کیوں نہیں ہوا؟ اس لئے جب مورخ اس سوال پر غور کرتا ہے کہ آخر یونان کیوں تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا؟ تو اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ "کیونکہ یونان کا وجود تھا اور اس ماحول میں رہتے ہوئے وہ ترقی کے علاوہ اور کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا"

یا دوسرا سوال کہ سکندر نے ہندوستان پر کیوں حملہ کیا ؟ تو اس کا جواب یہی دیا جا سکتا ہے کہ "سکندر فلپ کا لڑکا تھا۔ باپ کے عزائم، قوم کے کارنامے، ماحول کے اثرات وغیرہ اس کے کردار کو بنانے والے تھے اور اس بات کے ذمہ دار تھے کہ سکندر کو فاتح بنائیں" اب اگر اس کے کارناموں کو کسی مافوق الفطرت طاقت سے منسوب کر دیں یا اس کی بہادری و شجاعت کو تقدیر سے ملا دیں تو یہ تاریخ کے ساتھ بے انصافی ہوگی اور اس کے سپاہیانہ کارناموں، جنگی تدابیر اور منصوبوں کی اہمیت کو ختم کر دے گی۔

قومیں دوسروں سے مل جل کر اور خلط ملط ہو کر بہت کچھ سیکھتی ہیں۔ یونان نے اپنے آپ کو ایشیا والوں کے حملوں سے محفوظ رکھا، لیکن بعد میں وہ رومیوں، گوتھوں اور عیسائیوں کے ہاتھوں فتح ہوا۔ اس عمل میں تہذیب و تمدن کی روایات ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوئیں اور وقت اور طاقتوں کے عمل نے مختلف قوموں کو ایک دوسرے سے متاثر کیا۔ تاریخ میں ایسی ہزار ہا مثالیں ہیں، مثلاً: فونیقیوں نے یونانیوں کو الفاظ سکھائے اور جب یونانیوں نے بیکٹریا ہجرت کی تو انھیں ہومر کی شاعری سے روشناس کرایا۔ حالانکہ ہومر نے ان کیلئے نہیں لکھا تھا۔

ہر فلر اسے تقدیر کا کرشمہ سمجھتا ہے کہ وہ جس چیز کو چاہے محفوظ کر دے اور جس کو چاہے فنا۔ ہوسکتا ہے کہ ہومر سے اچھا کسی اور شاعر کا کلام ہو جو تقدیر کے ہاتھوں گمنامی میں روپوش ہو گیا ہو۔

ہرڈر جستجو اور علم کی خواہش کو انسان کی سب سے بڑی خواہش سمجھتا ہے کیونکہ ہر انسان اس تگ و دو میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ فطرت کے راز سے واقف ہو۔ لیکن اس کا دائرہ عمل 'فطرت' وقت اور جگہ ہے۔ وہ زندگی کے محدود چکر ہی میں رہتے ہوئے کچھ کر سکتا ہے۔ یہی اصول قوم 'ملک' اور سلطنت کے عروج و زوال پر بھی صادق آتا ہے۔

ہرڈر اس بات کا قایل ہے کہ سازگار ماحول اور حالات میں زندگی کی تکمیل حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس میں نہ تو اضافہ ممکن ہے اور نہ ہی اسے آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس کی صرف تقلید کی جا سکتی ہے۔ مثلاً: ہومر نے شاعری میں زور بیان کو کمال تک پہونچایا، اس کے بعد اور کوئی ہومر پیدا نہیں ہوا۔ ہومر کے رزمیہ چھپے ہیں جن میں اضافہ کرنے والوں نے دو چار بیتوں کا اضافہ ضرور کیا لیکن کوئی بھی اس کی بلندی کو نہیں چھو سکا۔ اسی طرح یونانی ادیبوں نے المیہ کا تمام مواد ختم کر دیا اور اب آنیوالے انھیں مختلف پہلوؤں سے بدل بدل کر لکھ رہے ہیں۔ قدیم آرٹ و ادب کی مثال اس درخت کی مانند ہے جو خزاں کا شکار ہو گیا ہو، لیکن اس کے زرد اور بکھرے ہوئے پتے زمین کو زرخیزی اور تازگی دیتے ہیں اور اس سے دوسرے درخت پیدا کرتے ہیں۔ شیکسپیر، سوفوکلس، ملٹن، لونگ بروک اور پیریکلس ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں تھے جنھوں نے ادب کے گلستاں میں خوشبو بکھیری۔

ہرڈر تاریخ میں ہر چیز اور شے کو فانی قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک

کوئی ادارہ، قبر، یا روایت لازوال اور ابدی نہیں۔ اس لئے جب بھی کسی سیاسی نظام کو استحکام ہوتا ہے یا اس کے انتظام سلطنت میں مقبولی آتی ہے تو آنے والی نسل کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ یہ سب کچھ مٹا دیا جائے۔ کیونکہ وہ پرانی اقدار اور روایات کے اندھیرے میں محدود زندگی گزارنا نہیں چاہتے، وہ اپنے ذہن کی وسعتوں سے نئی دنیا آباد کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ ان کی صحت مند اور جوان خواہشات نحیف و کمزور ڈھانچے کو گرا دیتی ہیں۔ لیکن وقت کے ساتھ یہ روایات بھی پرانی ہو جاتی ہیں اور ان کی جگہ لینے کیلئے دوسری نسل تیار ہو جاتی ہے۔ زندگی اور موت عروج و زوال کا یہ سلسلہ اسی طرح بغیر خاتمہ کے چلتا رہتا ہے۔

ہرڈر کے نزدیک آدمی فطرت کے قوانین کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اس کی جسمانی ساخت اس قسم کی ہے کہ کمزور ہونے کے بعد دوا اسے صحت مند نہیں بنا سکتی ہے۔ انسان اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ وہ آزاد ہے، لیکن اس کی زندگی کا ہر لمحہ تقدیر کے آہنی پنجوں میں جکڑا ہوا ہے اور وہ مجبور ہے کہ نپے تلے اور متعین راستے پر چلے۔ یہ اس کی قسمت اور تقدیر ہے کہ وہ زندہ رہے اور پھر مر جائے۔ ایک دانشمند جب اپنی زندگی کے دن پورے کر کے قبر میں سو جاتا ہے تو اس کا جانشین بچہ کی حیثیت سے اس کی جگہ لے کر اپنا سفر شروع کرتا ہے۔ اسی طرح سال پر سال گزرتے ہیں۔ سورج غروب ہوتا ہے۔ رات آتی ہے، اور انسانیت نئے چاند کی روشنی سے فیض اٹھاتی ہے۔ یہ ایک طویل اور نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ ایک

فرد کے بعد دوسرا فرد - ایک نسل کے بعد دوسری نسل - اور ایک سلطنت کے بعد دوسری سلطنت آتی ہے اور تاریخ کے اس سلسلہ میں کوئی خلا اور شگاف پیدا نہیں ہوتا - قومیں پھلتی پھولتی اور زوال پذیر ہوتی رہتی ہیں - لیکن تہذیب کی بالیدگی بڑھتی رہتی ہے. نئی صورتیں، نئی جگہیں، نیا ماحول اور زندگی کی نئی قدریں اسے رعنائی بخشتی رہتی ہیں۔

لیکن المیہ انسان کی تقدیر پر چھایا ہوا ہے۔ انسان کو اکزین کے پہیہ کے گرد باندھ دیا گیا ہے کہ وہ مسلسل مشقت کیئے جائے۔ وہ سسی فس (sisyphus) کی طرح مسلسل پتھر توڑ رہا ہے انسان پیہم جدوجہد، کوشش اور سعی کرتا ہے لیکن اس سے پیشتر کہ اس کی خواہش پوری ہو وہ مرجاتا ہے - اس کی تمام محنت لاحاصل ثابت ہوتی ہے - ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک سخت چٹان کاٹ رہا ہے یا سمندر کی موجوں پر لکھ رہا ہے - یہ موجیں پھیلتی، گرداب بناتی آگے چلی جاتی ہیں اور انسان کی محنت وکوشش و خیالات وتصورات کے عظیم محلات پاش پاش ہوجاتے ہیں.

تو انسان کیوں یہ لاحاصل اور بےکار محنت کرتا ہے؟ یہ کس کی مرضی ہے کہ وہ اپنی مختصر زندگی میں، محدود ایام میں روزانہ نپے تلے کام کئے جاتا ہے؟ وہ آخر کس مقصد کیلئے اپنی کمر پر یہ بوجھ لادے ہوے ہے؟ جسے وہ اپنے ساتھ اپنی قبر تک لے جاتا ہے، جب کہ اس سے یہ تک نہیں پوچھا جاتا کہ کیا وہ اس بوجھ کو اٹھانے کیلئے تیار ہے؟ اسے یہ تک آزادی نہیں کہ وہ کس جگہ اور کس وقت پیدا ہونا چاہتا ہے۔

تمام انسانی زندگی اور انسانی تاریخ گناہوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ خراب دستور، ظالم حکمران، اور بری حکومتیں یہ سب انسان کی تقدیر میں لکھی ہوئی ہیں۔ ایشیا، افریقہ اور دنیا کے مطلق السلطان حکمرانوں کے زمانے کو دیکھو، ان ظالموں کے کارناموں کا جائزہ لو جو روم کے تخت پر بیٹھے اور جن کے دورِ حکمرانی میں صدیوں انسانیت سسکتی رہی۔ بروٹس کا زوال ہوا، انتونی فتح یاب ہوا، جرمینکس (Garmanicus) مرتا ہے۔ تبریس، کالی گولا، اور نیرو حکومت کرتے ہیں۔ ارسٹائڈز جلاوطن ہوتا ہے۔ کنفیوشس آوارہ پھرتا ہے۔ سقراط اور سینیکا کو مروا دیا جاتا ہے۔ تمام تاریخ درد، الم، دکھ اور تکلیف کے المیہ میں لپٹی ہوئی ہے۔ خونریزی، مکاری، منافقت، اور جھوٹ ہر جگہ فتح یاب اور کامران ہے۔

ہیگل

جارج ولیم فریڈرش ہیگل نے ۱۷۷۰ء میں اسٹٹ گارڈ کے مقام پر پیدا ہوا۔ اعلیٰ تعلیم ٹیوبن گن یونیورسٹی میں حاصل کی۔ زمانہ طالب علمی میں کانٹ اور روسو کے نظریات سے متاثر ہوا۔ تعلیم کے بعد درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ برلن اور فرینکفرٹ یونیورسٹیوں میں پڑھانے کے بعد، ینا یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گیا۔ نپولین کی فتوحات نے جرمنی کو بری طرح متاثر کیا جس کی وجہ سے ینا یونیورسٹی کچھ عرصہ کیلئے بند ہو گئی۔ اس لئے ہیگل وہاں سے میونیرا چلا گیا۔ ۱۸۱۶ء میں وہ ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں پروفیسر ہوا۔ پھر ۱۸۳۱ء میں فختے کی جگہ برلن یونیورسٹی میں پروفیسر ہوا جہاں آخر وقت تک پڑھانے میں معروف رہا۔ ۱۸۳۱ء میں اس نے وفات پائی۔

ہیگل کی تصانیف نے انیسویں صدی کے فلسفہ، سیاست،

اور عمرانی علوم کو بڑا متاثر کیا۔ اس کے خیالات و نظریات کی چھاپ اس دور کے ہر فلسفی کے نظریات میں پوری طرح نمایاں ہیں۔ آخر عمر میں ہیگل نے "فلسفہ تاریخ" پر لیکچر دئے جنہوں نے نظریہ تاریخ میں انقلابی اضافہ کیا۔

تاریخ میں واقعات کا انبار، ان کی تراش خراش، کتر بیونت، کانٹ چھانٹ اور ترتیب معلومات کا ایک ذریعہ تو ہو سکتے ہیں، لیکن محض واقعات کوئی تاثر اور کوئی شعور و احساس پیدا نہیں کرتے۔ اس لئے شعور و احساس کو پیدا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ واقعات کے پس منظر میں جو اسباب، وجوہات اور حالات ہوتے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے، ان پر تنقید و رائے زنی کی جائے، ان کی اصل روح کو سمجھا جائے اور پھر واقعات کے سلسلہ اور ترتیب کو دیکھا جائے تو اسی صورت میں تاریخ افادیت کی حامل ہو سکتی ہے۔

ہیگل تاریخ کا مقصد یہ نہیں سمجھتا کہ صرف اور صرف واقعات کا تعین کیا جائے، اور انہیں خاص انداز میں بیان کیا جائے، بلکہ تاریخ کا اولین فرض یہ ہے کہ ان اسباب و علل اور دلائل پر غور کیا جائے جنہوں نے یہ واقعات پیدا کئے ہیں۔ اسی لئے فلسفہ تاریخ انسانی تاریخ کو سمجھنے میں بڑا مددگار ہوتا ہے۔ اور اس کی مدد سے انسانی تاریخ کو ابتداء سے لیکر موجودہ ترقی یافتہ زمانہ تک سمجھا جا سکتا ہے۔

انسانی تاریخ کے مطالعہ سے ذہن میں جو سوال آتا ہے وہ یہ کہ انسان نے دورِ وحشت و بربریت سے اس مہذب زمانہ تک یہ ترقی

کیوں کی؟ انسانی ڈرامہ جو اس اسٹیج پر کھیلا جا رہا ہے اس کا پلاٹ کیا ہے؟ انسان جس مقصد کیلئے جدوجہد کر رہا ہے وہ کیا ہے؟ اور اس میں اسے کس حد تک کامیابی ہوئی ہے!

ہیگل انسانی جدوجہد، کوشش، ترقی اور انسانی عروج و بلندی کے پس منظر میں عمل پذیر جذبہ کو "آزادی" کے نام سے موسوم کرتا ہے اس کے نزدیک انسانی تاریخ اور انسانی ڈرامہ کا پلاٹ "آزادی کی ترقی" ہے۔ آزادی سے مراد وہ حقوق اور قانون لیتا ہے جس کے نتیجہ میں ریاست وجود میں آتی ہے۔ آزادی روح کا جوہر ہے۔ اور تاریخ فلسفہ، روح فلسفہ کا ایک حصہ ہے۔ اس لئے تاریخ کا موضوع سائنس سے جدا ہے۔ کیونکہ فلسفہ تاریخ اس سوال کا جواب دیتا ہے کہ ریاست کس طرح وجود میں آئی؟ چونکہ انسانی آزادی اور احساس آزادی ایک چیز ہے، لہٰذا آزادی کا ارتقاء شعور و ذہن کا ارتقاء ہے۔ اس عمل میں ہر قسم کے افکار تشکیل پاتے ہیں۔ اس لئے فلسفۂ تاریخ صرف انسانی عمل ہی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ وہ کائناتی عمل سے بھی پردہ اٹھاتا ہے۔

ہیگل روح (Spirit) اور مادہ (Matter) کی خصوصیات بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ مادہ کا جوہر کشش ثقل ہے، اور روح کا جوہر آزادی ہے۔ اور یہ آزادی روح کی مکمل حقیقت ہے۔ یہ آزادی کن ذرائع سے ترقی کرتی ہے؟ دراصل یہی تاریخ کا موضوع ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی عمل کی بنیاد اس کی فوری ترق

اور خواہشات پر ہے۔ انسانی جذبات، کردار اور صلاحیتیں معاشرے میں حرکت پیدا کئے رکھتی ہیں۔ ان خواہشات و ضروریات میں چند اعلیٰ و ارفع جذبات بھی شامل ہیں۔ مثلاً: سخاوت یا حب الوطنی، لیکن ان کی اہمیت دوسروں کے مقابلہ میں کم ہے۔ خاص مقاصد اور خود غرضی سب سے زیادہ انسان میں حرکت پیدا کرتی ہیں۔ ان کی طاقت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ یہ قانون اور اخلاق کو جو ان پر پابندی عاید کرتے ہیں، انہیں توڑ کر اور نظر انداز کر کے اپنے اپنے مقاصد کی تکمیل کراتے ہیں۔

ہیگل کے نزدیک ریاست وہ شے ہے جس میں فرد پوری طرح آزادی سے فیض یاب ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ چند افراد تمام آزادی پر قابض نہ ہو جائیں۔ اس لئے اسے اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ہر فرد کو اپنا حصہ مل سکے۔ معاشرے میں پابندیاں ضروری ہیں تاکہ تمام افراد آپس کے میل جول سے آزادانہ زندگی گذار سکیں۔

تاریخ میں ریاست کا وجود انسانی مقصد کی انتہائی تکمیل ہے۔ انسان جن خصوصیات کا مالک ہے وہ سب اسے ریاست کی بدولت ملتی ہیں۔ ریاست ایک الہیاتی دستور ہے جو اس سرزمین میں عملی شکل میں موجود ہے۔ اس لئے ریاست میں تاریخ کے مقصد کو پایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں آزادی اپنا مقصد پورا کرتی ہے اور قانون روح کی مقصدیت بنتا ہے۔ اس لئے وہ خواہش جو قانون کے تابع ہو وہ آزاد ہے کیونکہ اس طرح وہ خود کی فرماں بردار ہے۔ جب انسان اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دیتا ہے تو آزادی اور ضرورت دونوں ختم

ہو جاتی ہیں۔ ریاست کا وجود افراد کو سرگرم عمل رکھتا ہے اور معاشرے کا نظامِ اخلاق بناتا ہے ۔ قوانین، انتظام ، اور ریاست کے اراکان کے حقوق مل کر ریاست کا دستور پیدا کرتے ہیں ۔ جب کہ فطری پہلو مثلاً: پہاڑ ، آب وہوا ، اور پانی ایک ملک کا تصور بناتے ہیں ۔ جائداد ، آباؤ اجداد کی تاریخ اور ان کے کارنامے ، ماضی کا ورثہ ، اور اس ورثہ میں ان کا وجود ، یہ سب وطن کی محبت پیدا کرتے ہیں ۔ اس لئے جو قوم ان حالات میں ارتقاء کرتی ہے اس کی ذہانت کو انھیں حالات میں سمجھنا اور دیکھنا چاہیئے ۔

ہیگل اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ تاریخ ایک سلسلہ ہے اور تاریخ کا ہر دور ایک دوسرے سے ملا ہوا ہے ۔ ماضی حال سے پیوستہ ہے ۔ ہر قوم اپنی ترقی و عروج کے بعد اپنا ورثہ چھوڑ دیتی ہے جو تاریخی ترقی کے عمل میں کام آتا ہے ۔ اسی لئے قومیں پیدا ہوتی ہیں اور مر جاتی ہیں ، لیکن مرتے وقت وہ اپنے افکار و خیالات چھوڑ جاتی ہیں جو آنیوالی نسل کے تازہ اور زرخیز ذہن و شعور میں جذب ہو جاتے ہیں ۔ اس جدلیاتی عمل میں انسانی ذہن زندگی کی نت نئی تبدیلیوں اور تجربات میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا رہتا ہے ۔

ہیگل جب تبدیلی و ترقی ، عروج و زوال ، تراش و خراش ، تعمیر و تخریب اور شکست و ریخت کے موضوع پر بحث کرتا ہے تو وہ اس تبدیلی و ترقی کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے : ایک فطری ، جس میں تبدیلی و ترقی اندھی اور غیر شعوری احساس کے ساتھ ہوتی ہے ۔ دوسری تاریخی ، جس میں یہ ترقی اور تبدیلی عقل و ذہن کے ساتھ شعوری اور قطعیت کے ساتھ ہوتی

ہے۔ اس فطرت اور تاریخ دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ فطرت کوئی تاریخ نہیں رکھتی بلکہ وہ ایک چکر میں گردش کرتی رہتی ہے اور اس بار بار کی گردش سے جو کچھ سامنے آتا ہے اس سے نہ تو کچھ تعمیر ہوتا ہے اور نہ ہی کچھ بنتا ہے۔ ہر روز سورج کا طلوع ہونا، بہار کا آنا، اور ہر اونچی لہر کا روپوش ہو جانا فطرت میں یہ سب اپنا آخری اور قطعی کردار ادا کرتے ہیں اور پھر ان کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ فطرت کی گردش کے قانون اٹل ہیں یہ کبھی نہیں بدلتے، چاہے وہ اپنے آپ کو کتنی ہی بار کیوں نہ دہرائیں۔

اس کے برعکس مورخ صرف واقعات ہی کو جمع نہیں کرتا، بلکہ ان کی وجوہات و اثرات کو بھی بیان کرتا ہے۔ ان کے مقاصد اور نصب العین کو بھی دیکھتا ہے۔ اس لئے اس کا طریقہ کار فطرت سے جدا ہو جاتا ہے۔ تاریخ اس وقت تک تاریخ نہیں ہوتی جب تک اس میں عمل نہ ہو۔ اس لئے سوائے انسانی تاریخ کے اور کوئی تاریخ نہیں اور یہ انسانی تاریخ بھی اپنے آپ کو نہیں دہراتی، کیونکہ تاریخ کی حرکت چکر (circle) میں نہیں بلکہ مخروطی (Spiral) شکل میں ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ضرور ہوتا ہے کہ واقعات اپنے آپ کو دہرا رہے ہیں، لیکن ان کے اثرات اور نتائج مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً جنگ ہوتی رہتی ہے مگر ہر جنگ دوسری جنگ سے بدلی ہوئی ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کے نتائج اور اثرات بھی مختلف ہوتے ہیں۔

ہیگل کے نزدیک تمام تاریخ انسانی فکر کی تاریخ ہے۔ کوئی مورخ فکر کے بغیر تاریخ میں ہونے والے واقعات کی روح تک نہیں پہونچ سکتا ہے۔ مثلاً: اگر پہلی صدی میں رومی شہنشاہوں اور سینیٹ کے جھگڑوں کی

تاریخ کو بیان کیا جائے، تو مورخ سب سے پہلے یہ دیکھے گا کہ ان دو مخالف جماعتوں نے کیا سیاسی صورتِ حال پیدا کی، اور پھر ان کے جھگڑوں نے معاملات کو کس طرح آگے بڑھایا۔ وہ اسی سیاسی پس منظر کو دیکھے گا جو ان دو جماعتوں سے متعلق ہو گا۔ اس لئے ایک مورخ کا کام "لوگوں نے کیا کیا سے زیادہ جاننا ہے کہ انہوں نے کیا سوچا؟"

تاریخ کے عمل کی اصل حقیقت فہم و ادراک ہے۔ کیونکہ تاریخ میں جو کچھ ہوتا ہے وہ انسان کی مرضی سے ہوتا ہے۔ اسی لئے تاریخی عمل انسان کی حرکت پر مبنی ہے اور انسان کی مرضی اس کے سوا اور کچھ نہیں جو حرکت و عمل سے ہوتی ہے۔ انسان میں عقل اور جذبات دونوں موجود رہتے ہیں اور کوئی بھی شخص صرف جذبات یا عقل سے کام نہیں کر سکتا ہے۔ اس کے جذبات عقل سے اور عقل جذبات سے ملی ہوتی ہے۔ اس لئے بغیر جذبہ کے کوئی عمل نہیں ہو سکتا۔ ایک منصف مجرم کو سزا دیتے ہوئے یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ جذبات سے مبرا ہے، لیکن انصاف اور دانش مندی کے جذبات اس میں موجود ہوتے ہیں۔ تاریخ میں ہمیشہ عقل جذبات پر حکومت کرتی ہے۔ وہ انہیں جس طرف چاہتی ہے موڑ دیتی ہے اور اپنی کامیابی کیلئے استعمال کرتی ہے۔

ہیگل تاریخ میں شخصیتوں کے عمل کو ایک نئے انداز سے دیکھتا ہے۔ افراد یا شخصیتیں اگرچہ اپنی ذاتی خواہشات کے تحت عمل کرتی ہیں، لیکن ماحول اور حالات انہیں غیر شعوری طور پر وہ کام کرنے پر مجبور کرتے ہیں جو تہذیب و تمدن اور تاریخ انسانی میں اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ سیزر نے دستور، قانون اور اپنے مخالفوں کو ختم کر کے آمریت و شہنشاہیت

قائم کی ۔ اس نے اپنی بڑائی اور عظمت کی خاطر رومی شہنشاہیت کو فتوحات کے ذریعے وسعت دی، یہ اس کی ذاتی خواہش تھی، لیکن ایک غیر شعوری عمل جو سازگار ماحول میں پیدا ہوا، وہ رومی شہنشاہیت کا استحکام اور عظمت تھی، یہی صورتِ حال تمام شخصیتوں کے ساتھ رہی، ان کی ذاتی خواہش ان عظیم مقاصد سے مل گئی جو آفاقی روح (World Spirit) کی مرضی تھی، ان شخصیتوں نے غیر شعوری طور پر اس کے مقاصد کی تکمیل کی جب کہ درحقیقت ان کے سامنے اپنے مقاصد تھے ۔

اگر تاریخ میں ان شخصیتوں کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ خوشی و مسرت سے دور، آرام و پرسکون زندگی سے محروم، محنت و مشقت سے تنہا اور گریاعمل زندگی گزارنے پر مجبور رہے ۔ انہوں نے سختی سے اپنے مقصد کی تکمیل کی، جب انھوں نے یہ مقصد حاصل کرلیا تو وہ ایک خالی اور سوکھے چھلکے کی طرح جس کا گودا ختم ہو گیا ہو، گر کر ختم ہو گئے : جیسے سکندر جو عین جوانی میں مر گیا، یا سیزر، جو قتل کر دیا گیا، یا نپولین جو جلا وطن کر دیا گیا ۔ ان شخصیتوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عظیم تاریخی شخصیتیں تھیں، کیونکہ انھوں نے کچھ حاصل کرنے اور پانے کی خواہش کی اور پھر اسے تکمیل تک پہنچایا ۔

انسان کن مقاصد کی تکمیل کرتا ہے ۔ مذہبی نقطۂ نظر سے انسان خدا کے منصوبے کو پورا کرتا ہے ۔ کانٹ کے نظریے کے تحت انسان فطرت کے مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچا رہا ہے اور غیر شعوری طور پر اس کا آلۂ کار ہے ۔ ہیگل ان دونوں نظریوں سے اختلاف کرتے ہوئے انسان کے مقاصد کو فہم و

ادراک کی تکمیل قرار دیتا ہے۔ فہم و ادراک انسان کی منزل متعین کرتے ہیں جسے انسان عقل اور جذبات کی مدد سے پانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے عقل اور جذبات جو دو متضاد عناصر ہیں آپس میں مل جاتے ہیں۔ انسانی زندگی میں منطقی و غیر منطقی عناصر کا ملنا تحریک کا باعث ہوتا ہے جس کی وجہ سے انسان خاموش اور جامد نہیں رہتا، بلکہ برابر عمل اور حرکت کی حالت میں رہتا ہے۔ اسی لئے انسانی ذہن ان تبدیلیوں سے تجربات حاصل کرتا رہتا ہے۔

ہیگل تمام تاریخ کو فکری تاریخ کہتا ہے، جو عقل کے ارتقاء کو ظاہر کرتی ہے لہذا تاریخی عمل در اصل منطقی عمل ہے۔ تاریخ میں جو تبدیلی اور ترقی ہوتی ہے وہ اچانک نہیں ہوتی، بلکہ حالات کے تحت اسے ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے ہماری معلومات تاریخی عمل کے بارے میں صرف تجرباتی نہیں، بلکہ پہلے سے طے شدہ ہیں جس کی وجہ سے ہم تاریخی تبدیلی کی ضرورت کو سمجھ سکتے ہیں۔
تاریخ انسان کے عمل، طریق اور افعال کا نام ہے۔ یہ داخلی اور خارجی پہلو رکھتی ہے۔ خارجی پہلو وہ واقعات ہیں جو زمان و مکاں میں ہوتے ہیں اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ داخلی پہلو وہ افکار ہیں جو ایک دوسرے سے منطقی طور پر ملے ہوتے ہیں۔

ہیگل نے اپنے نظریہ جدلیاتی عمل کو تاریخی عمل پر منطبق کیا ہے، جس میں ایک نظام اپنا مخالف نظام پیدا کرتا ہے پھر ان کے ملاپ سے تیسرا نظام پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً: یونان نے اپنا مخالف روم پیدا کیا اور اس

دعویٰ کے خلاف۔ دعویٰ نے امتزاج کے بعد عیسائیت کے غلبہ کو پیدا کیا۔ لہٰذا یہ جدلیاتی عمل، دعویٰ، ضد دعویٰ اور امتزاج، تاریخ میں ملتا ہے اور تاریخی تبدیلی و تغیر اسی جذبہ کے تحت ہوتی ہے۔

ہیگل کے نزدیک تاریخ زمانۂ حال پر ختم ہوتی ہے کیونکہ مورخ مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ واقعات کا تعین شہادتوں کی بنیاد پر کرتا ہے اس لئے مستقبل کا تعین کرتے وقت کسی کتاب یا شہادت کا حاصل کرنا ناممکن ہوتا ہے، اس لئے مورخ کیلئے مستقبل ایک بند کتاب اور روپوش افق ہے، جس کے واقعات کا تعین اس کی طاقت سے باہر ہے۔ اس لئے تاریخ زمانہ حال پر ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس وقت تاریخی عمل اس کی نگاہوں میں مکمل ہوتا ہے۔ جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو چکتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حال میں ساری ترقی آکر رک جاتی ہے اور مستقبل اندھیرے میں چلا جاتا ہے، بلکہ اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ حال ایک تعلقی چیز ہے اور مستقبل ایک غیر مرئی شے جس میں معلومات اور واقعات نہیں ہوتے، بلکہ امید، خوف اور ڈر کے جذبات ہوتے ہیں اور امید و بیم کے جذبات کی تاریخ نہیں ہوتے۔

مارکس

کارل مارکس ۱۸۱۸ء میں ترائر کے مقام پر پیدا ہوا۔ سترہ سال کی عمر میں اس نے قانون کے طالب علم کی حیثیت سے یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ وہ ہیگل کے نظریات سے متاثر ہوا، اور قانون چھوڑ کر فلسفہ پڑھنا شروع کر دیا۔ تعلیم کے بعد اس نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا، اپنے نظریات کی وجہ سے اس نے تمام عمر جلاوطنی میں گزاری۔ ۱۸۸۳ء میں بمقام لندن اس کا انتقال ہوا۔ مارکس کا نظریہ تاریخ اس کی مختلف تصانیف میں ملتا ہے۔ جن میں خصوصیت سے مندرجہ ذیل قابلِ ذکر ہیں:

The German Ideology.
Poverty of Philosophy.
The Communist Manifesto.

انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی کس جذبہ کے تحت ہو رہی ہے؟ تاریخی عمل میں کون سے عوامل ہیں جو انسان کو آگے کی جانب لے جا رہے ہیں؟ وہ کن مقاصد کی تکمیل کر رہا ہے؟ اور کیا ان مقاصد کی تکمیل شعوری ہے یا غیر شعوری؟

ان سوالات کا جواب فلسفۂ تاریخ میں مختلف نظریات کے تحت دیا گیا ہے: مذہبی نقطۂ نظر سے انسان خدا کے مقاصد پورے کر رہا ہے۔ کانٹ ان مقاصد کو فطرت سے منسوب کرتا ہے۔ ان دونوں نظریات میں انسان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں، بلکہ وہ خدا اور فطرت کا آلۂ کار ہے اور غیر شعوری طور پر ان قوتوں کے لئے کام کر رہا ہے۔ ان دونوں نظریوں سے ہٹ کر تیسرا نظریہ یہ ہے کہ انسان عقل و شعور، غور و فکر اور علم و دانش کا پیکر ہے، اس میں سوچنے، سمجھنے اور عمل کرنے کی صلاحیت ہے اس لئے وہ کسی قوت کا آلہ کار نہیں، بلکہ ایک خود مختار ہستی ہے جو اپنی مرضی اور خواہش کی مالک ہے۔ اس نے جذبۂ جستجو کے تحت باعمل ہو کر آسمانوں، زمینوں، سمندروں، پہاڑوں اور دریاؤں کے سربستہ راز معلوم کئے اور اسی جذبہ کے تحت اس نے فطرت کی بند کتاب کو کھولا اور فطرت پر قابو پایا۔

مارکس ان تمام نظریوں سے اختلاف کرتا ہے۔ اس کے نزدیک تاریخی عمل انسان کی سرگرمیوں اور تہذیب و تمدن کی ترقی میں انسان کی معاشی ضروریات اور اقتصادی احتیاجات بنیادی طور پر سب سے زیادہ اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ تاریخی ارتقاء کا راز اسی میں ہے کہ آدمی اپنی بنیادی معاشی ضروریات کس طرح بہم پہنچاتا ہے۔

ایک وقت میں وہ ہتھیار بنا کر اور شکار کر کے اپنی ضروریات پوری کرتا تھا تو دوسرے وقت میں کھیتی باڑی کر کے اور غلہ اگا کر۔ لہٰذا ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک ترقی میں اس کی معاشی ضروریات ہیں۔ پیداوار کا عمل اس کی سرگرمیوں میں اور ایجادات کا باعث رہا اور یہی عمل معاشرے کے قیام اور پھر قانون و سیاست، اخلاق و مذہب، فلسفہ و فکر کے تخلیق ہونے کا باعث ہوا۔ مارکس ایک جگہ کہتا ہے کہ:

"صنعت و حرفت کی تبدیلی کے ساتھ انسان اپنے سماجی تعلقات بھی بدلتا رہتا ہے۔ ہینڈمِل (Handmill) جاگیرداری کا معاشرہ پیدا کرتی ہے تو بھاپ کا انجن صنعتی سرمایہ داری کو جنم دیتا ہے انھیں مادی ذرائع کے ساتھ ساتھ انسان اپنے سماجی تعلقات بدلتا اور قائم کرتا رہتا ہے اور انھیں تعلقات کی بنا پر وہ افکار و نظریات تخلیق کرتا ہے۔"

ایک دوسری جگہ وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"کیا وہ لوگ تاریخ کا ایک لفظ بھی سمجھ سکتے ہیں جو صنعت و حرفت کو یکسر خارج کر دیتے ہیں؟ کیا کسی دور کو اس کی صنعت و حرفت کے بغیر سمجھا جا سکتا ہے؟ پیداوار کے ذرائع جو حقیقت میں حقیقی زندگی ہیں، ان کو خارج کرنے کا مطلب ہے کہ روح کو جسم سے نکال دیا جائے اس لئے جو لوگ فطری سائنس اور صنعت و حرفت کو علیحدہ سمجھتے ہیں اور تاریخ کو مادی پیداوار میں نہیں پاتے، ایسے لوگ تاریخ کو آسمان کے دھندلے بادلوں میں تلاش کرتے ہیں۔"

مارکس ہیگل کے نظریۂ تاریخ پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ مجرد اور روحِ مطلق کے مفہوم کو پیدا کرتا ہے۔ ہیگل تجرباتی اور عام فہم ڈھانچہ میں تخیلاتی اور خفیہ تاریخ پیش کرتا ہے، جس کی وجہ سے انسانیت کی تاریخ، انسانیت کی مجرد روح کی تاریخ ہو جاتی ہے وہ روح جو انسانی پہونچ اور دسترس سے بہت آگے ہے۔

مارکس اس کے برعکس تاریخی عمل میں انسان، اس کی حقیقی زندگی، اس کی سرگرمیوں اور اس کی مادی ضروریات کو دیکھتا ہے۔ تاریخ انسان کی تمام زندگی کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ اس لئے تاریخ میں انسان کی قطعی ضروریات کو دیکھا جاتا ہے۔ تاریخ کی ابتداء ان فطری بنیادوں پر ہونا چاہئے جنھیں انسان عملی طور پر تشکیل دیتا ہے۔ انسان خود کو حیوانات سے اسی وقت ممتاز سمجھتا ہے جب وہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے کچھ پیدا کرتا ہے، اس عمل کو وہ جسمانی طاقت کے ذریعہ کرتا ہے۔ اس لئے پیداوار کا مطلب ہے کہ انسان اپنی مادی زندگی کا سامان فراہم کر رہا ہے۔ تاریخ کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ پیداوار کے طریقِ عمل کو دیکھا جائے کیونکہ اسی بنیاد پر انسانی زندگی میں تغیر و تبدل ہوتا ہے اور اسی کی روشنی میں معاشرہ کا ارتقاء سمجھ میں آتا ہے۔ ابتداء میں جب پیداوار کے ذرائع سادہ اور سہل تھے تو معاشرہ بھی اسی طرح سادہ اور غیر پیچیدہ تھا، اس میں سادگی اور صفائی تھی، لیکن پیداوار کے طریقوں اور ذریعوں کے ساتھ ساتھ معاشرہ مختلف مراحل سے گذرا اور اسی ارتقائی دور میں مذہب، فلسفہ، اخلاق اور نظریات تشکیل پائے۔

تاریخی عمل میں سیاست، ریاست، مذہب، حکمرانوں کی سرگرمیاں

فتوحات، شان و شوکت و عظمت، ریاست کی بڑائی اور اخلاق کی بلندی اس قدر اہم کردار ادا نہیں کرتیں، جس قدر کہ معاشی ضروریات اس لئے ان کو کسی بھی دور کی محرک قوت سمجھنا غلطی ہے، کیونکہ یہ محرک قوت نہیں بلکہ محض اس کی پرچھائیاں ہیں۔

مارکس اس بات سے کسی چیز کا تعین نہیں کرتا کہ انسان کیا کہتا ہے سوچتا ہے، یا تصور کرتا ہے؟ یا اس نے کیا کہا، سوچا اور تصور کیا؟ اس کے بجائے وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ یہ دیکھنا چاہیے کہ انسان نے کیا مادی ترقی کی اور اس مادی ترقی کے نتیجہ میں اخلاق، مذہب، سیاست، اور دوسرے نظریات پیدا کئے۔ افکار و نظریات مادی ترقی کی پیداوار ہوتے ہیں، اس لئے یہ خود مختار نہیں، ان کی اپنی علیحدہ سے کوئی تاریخ نہیں اور نہ ہی ان کی نشوونما اور ترقی علیحدہ سے ہوئی ہے۔ ان کے ارتقاء میں انسان کی مادی ترقی اور پیداوار کے ذرائع ہیں، جنھوں نے ان کی ہیئت اور ساخت میں تبدیلی کی۔ اس لئے زندگی شعور و ادراک سے متعین نہیں ہوتی، بلکہ شعور زندگی کے عمل سے بنتا ہے۔ اس لئے انسان محرک اور باعمل ہے، اس لئے انسانی تاریخ مبالغہ آمیزی کا مجموعہ نہیں، بلکہ انسان کی حقیقی زندگی کا عکس اور تصویر ہے۔

تاریخ کے مطالعہ کے بعد مارکس اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ جو جماعت ذرائع پیداوار پر قابض ہوگی، حکومت کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں ہوگی، اس جماعت کے خیالات معاشرے پر حاوی ہوں گے اور ذہنی طور پر معاشرہ ان کی بنائی ہوئی روایات اور اقدار کی زنجیروں

میں جکڑا ہوا ہوگا۔ جو طبقہ اقتصادی طور پر بدحال اور مادی ذرائع سے محروم ہوتا ہے وہ کبھی بھی ذہنی یا جسمانی طور پر معاشرہ پر تسلط حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے خیالات و افکار ہمیشہ حکمراں طبقہ کے ماتحت ہوں گے۔ اقتدار پر قابض طبقہ اسے ہمیشہ ذہنی طور پر غلام بنائے رکھے گا۔ حکمراں طبقہ کا فرد جب فلسفی بن کر افکار تخلیق کرتا ہے تو حکومت ان کی تشہیر میں حصہ لیتی ہے اور یہی خیالات معاشرہ کے اعلیٰ خیالات بن جاتے ہیں۔ جب مطلق العنانیت، امراء اور زمینداروں میں اقتدار حاصل کرنے کی کشمکش شروع ہوئی تو اس وقت طاقت کی علیحدگی کا نظریہ پیدا ہوا تاکہ ہر جماعت کو کچھ حقوق مل جائیں اور طاقت تقسیم ہو جائے۔ اس نظریہ کو تسلیم کرنے کے بعد اسے آفاقی قانون کہا گیا۔

اسی طرح جب امراء کا اقتدار ہوا، تو امراء نے اپنی طاقت کے استحکام کی خاطر عزت و وفاداری کے جذبات کو فروغ دیا۔ جب بورژوا طبقہ اقتدار پر قابض ہوا، تو اس نے مساوات اور آزادی کا نعرہ بلند کیا۔ اس عمل میں ہر طبقہ نے اپنے اقتدار کی بنیاد جن اقدار پر رکھی اسے آفاقیت کا درجہ دیا، اور لوگوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ یہی افکار اور اقدار حقیقی ہیں، اور ان ہی سے ہمارے معاشرے کی فلاح و بہبود ہو سکتی ہے۔

جب معاشرہ اس طبقاتی اقتدار کے خلاف آواز بلند کرتا ہے تو ان کی یہ آواز اور صدائے احتجاج کسی ایک گروہ یا جماعت کی نہیں ہوتی بلکہ پورے معاشرے کی ہوتی ہے جو با اقتدار طبقہ سے لڑتا ہے

اور ان تمام افراد، گروہوں، اور جماعتوں کو شامل کر لیتا ہے جو اقتدار سے محروم ہوتے ہیں۔ جنگ کی کامیابی کے بعد محروم طبقہ بھی فیضیاب ہوتا ہے۔ مثلاً: انقلابِ فرانس میں بورژوا طبقہ کی کامیابی سے بہت سے پرولتاری بھی بہرہ مند ہوئے اور انہوں نے اپنا رتبہ بڑھا کر بورژوا طبقہ کے برابر کر لیا۔ ہر نیا فاتح طبقہ جب اقتدار قائم کرتا ہے تو اس کا اقتدار پہلے والے طبقہ سے زیادہ وسیع بنیادوں پر ہوتا ہے، لیکن ساتھ ہی با اقتدار اور اقتدار سے محروم طبقوں میں مخالفت باقی رہتی ہے، اس لئے ایک جماعت کا با اقتدار ہونا، اس میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو شریک کرنا، پھر اس کی مخالفت اور خاتمہ، اس عمل سے معاشرہ میں اقتدار زیادہ سے زیادہ وسیع بنیادوں پر پھیلتا چلا جاتا ہے

-

مارکس تاریخ کو طبقاتی کش مکش کہتا ہے۔ ہر دور میں دو طبقے کش مکش اور تصادم میں معروف رہتے ہیں۔ مثلاً قدیم روم میں امراء اور غریب عوام، قرونِ وسطیٰ میں جاگیر دار اور کسان یا سرف، موجودہ صنعتی دور میں سرمایہ دار اور مزدور، یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ معاشرہ میں ہمیشہ ظالم و مظلوم، حکمراں و رعیت، با اقتدار اور اقتدار سے محروم طبقوں میں تصادم رہا ہے۔

اس طبقاتی جنگ میں ہر مرحلہ پر با اقتدار طبقہ کو شکست دیکھنا پڑی اور محروم طبقہ برابر اپنا اثر و رسوخ اور طاقت کو بڑھاتا رہا۔ مثلاً قرونِ وسطیٰ میں برگر (Burghers) پیدا ہوئے اور پھر ان سے موجودہ بورژوا طبقہ ابھرا۔ امریکہ کی دریافت، راس امید کا راستہ، نو آبادیاتی نظام کی ابتداء نے بورژوا طبقہ کو نئے میدان اور منڈیاں فراہم کیں، جس نے

اس کی دولت اور طاقت میں بے انتہا اضافہ کر دیا۔ دورِ جاگیرداری میں صنعت و پیداوار پر گلڈ کا قبضہ تھا، لیکن محدود پیداوار بڑھتی ہوئی ضروریات کے لئے ناکافی تھی، اس لئے جب پیداوار کے ذرائع میں اضافہ ہوا تو گلڈ ماسٹر کا زمانہ ختم ہوا، اور اس کی جگہ درمیانی درجہ نے لے لی۔ لیکن جب منڈیاں زیادہ ہوئیں، اشیا کی مانگ بڑھی اور فنی ماہرین ان بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا نہ کر سکے تو ان کی جگہ بھاپ اور مشین نے لے لی۔ اور فنی ماہرین کی جگہ صنعتی سرمایہ دار قابض ہو گئے۔ درمیانی درجہ کا تسلط ختم ہوا اور کروڑ پتی تمام صنعت و حرفت پر قابض ہو گئے۔

بورژوا طبقہ نے تاریخ میں ترقی کے ہر مرحلہ پر سیاسی حقوق حاصل کئے۔ زمانۂ جاگیرداری میں یہ طبقہ مظلوم تھا۔ قرونِ وسطیٰ کے فرانس میں اس نے کمیون قائم کئے، اٹلی اور جرمنی میں اس نے جمہوری حکومتوں کی داغ بیل ڈالی، پھر فرانس میں تھرڈ اسٹیٹ بن کر ابھرا، جدید صنعتی دور میں بورژوا طبقہ فتح یاب ہوا اور اس نے سیاسی و معاشی طاقت حاصل کی۔

بورژوا طبقہ جب بھی طاقت و استحکام حاصل کرتا ہے تو یہ زمانۂ جاگیرداری کی تمام روایات توڑ دیتا ہے۔ یہ انسان اور انسان میں کسی اعلیٰ مقصد کو نہیں بلکہ ذاتی غرض اور نقد ادائیگی کی روایت کو قائم کرتا ہے۔ یہ مذہب کی تمام اعلیٰ اقدار، مثلاً شجاعت و بہادری کے جذبات کو ذاتی غرض کے ٹھنڈے پانی میں ڈبو کر سرد کر دیتا ہے۔

بورژوا طبقہ اقتدار میں آنے کے بعد تمام ذرائع پیداوار پر تسلط جما لیتا ہے اور اس طرح دولت سمٹ کر ایک ہی طبقہ میں آ جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے معاشرے کے دوسرے طبقے تمام حقوق اور بنیادی ضروریات سے محروم

ہو جاتے ہیں ۔ یہاں تک کے پرولتاری طبقہ دولت و طاقت اور مراعات سے محروم، بورژوا طبقہ سے نبرد آزما ہو جاتا ہے ۔ اس طبقاتی کش مکش میں پرولتاری طبقہ مسلسل اپنی طاقت بڑھاتا رہتا ہے، کیونکہ درمیانی درجہ اور چھوٹے دوکاندار و تاجر جو نہ تو سرمایہ کے مالک ہوتے ہیں اور نہ فنی صلاحیتوں میں سرمایہ دار سے مقابلہ کر سکتے ہیں، دولت و سرمایہ سے محروم پرولتاری طبقہ میں شامل ہو جاتے ہیں ۔ دولت سمٹ کر محدود سے محدود طبقہ میں جمع ہوتی رہتی ہے ۔ یہاں تک کہ معاشرہ میں سرمایہ داروں کی اقلیت ہو جاتی ہے جو دولت، طاقت اور اقتدار پر قابض ہوتے ہیں، دوسری طرف محروم پرولتاری طبقہ ہوتا ہے جو اپنی تعداد اور زندگی کے لئے اجتماعی طور پر متحد ہو کر بورژوا طبقہ کا تختہ الٹ دیتے ہیں ۔

تاریخ کی طبقاتی کش مکش میں یہ آخری کش مکش ہوگی، جس میں پرولتاری فتح یاب ہوں گے اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے گا جو طبقاتی تفریق سے آزاد ہوگا ۔

برک ہارڈٹ

جیکب کرسٹوف برک ہارڈٹ ۱۸۱۸ء میں باسل میں پیدا ہوا
جرمنی، اٹلی، ہالینڈ اور بلجیم میں تعلیم حاصل کی۔ بعد میں باسل
یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر ہوا۔ فلسفۂ تاریخ پر اس کی
مندرجہ ذیل کتابیں ہیں:

— Reflection on History.
— The Great Men of History.
— On Fortune and Misfortune of History.

۱۸۹۷ء میں اس کا انتقال ہوا۔

واقعات کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملتی رہتی ہیں۔ تاریخ کی زنجیر طویل تر ہوتی جاتی ہے۔ زمانہ ان واقعات کے دباؤ سے آگے بڑھتا رہتا ہے

یہ ایک عظیم، پرشکوہ، اور محیرالعقول سلسلہ ہے، جس میں انسانی زندگی و حوش کے محدود دائرے میں جدوجہد کرتا نظر آتا ہے۔ اس کی جدوجہد کے اس وسیع و عریض سلسلہ کے تین پہلو ہیں، جن کے دائرے میں انسانی تاریخ برابر گھومتی اور چکر کھاتی ہے یعنی: ریاست، مذہب، اور کلچر۔ بکہارڈٹ کے نزدیک تاریخ کا سلسلہ ان تین دائروں میں مقید اور گرفتار رہتا ہے۔ ان تین عناصر میں کوئی شے مشترک نہیں اور نہ ہی ان میں یکجہتی ممکن ہے۔ ان میں سے ہر ایک علیحدہ خصوصیت اور اقدار کا مالک ہے۔ اگر ریاست اور مذہب کو جبریہ ملا بھی دیا جائے تو پھر بھی کلچر ان سے علیحدہ رہے گا۔ کیونکہ ریاست اور مذہب سیاسی و ابتدائی ضروریات کو پورا کرتا ہے جب کہ کلچر مادی اور روحانی ضروریات کے محدود دائرے میں رہتے ہوئے افراد کو تسکین و فرحت بخشتا ہے۔ یہ معاشرے اور انسانی زندگی کے تمام مادی وسائل و ان کی ترقی، روحانی اقدار، سماجی اثرات، ٹکنالوجی، ادبیات، اور سائنس کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس میں زندگی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ سمٹ آتی ہے۔ یہ ایک متنوع، آزاد، لیکن محدود دائرہ اور شعبہ ہے جو کبھی آفاقی نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی طاقت و قوت سے اپنا اقتدار قائم کر سکتا ہے۔

بکہارڈٹ کے نزدیک کوئی ریاست ایسے حقیقی معاہدے کے تحت وجود میں نہیں آسکتی جس میں تمام جماعتیں خوشی سے داخل ہوں۔ تاریخ میں ایسے معاہدے ضرور ملتے ہیں کہ جب کوئی جماعت مجبوری سے اس پر تیار ہوتی ہو۔ جیسے رومی شہنشاہیت کے آخری دور میں کمزور اور کانپتے ہوئے رومیوں نے فاتح ٹیوٹونوں سے کیا تھا۔ لیکن یہ حقیقی معاہدہ نہیں

ہو سکتا۔ اس لیئے اگر اس قسم کے معاہدے سے کوئی ریاست وجود میں آتی ہے تو وہ انتہائی کمزور اور نحیف ہوتی ہے۔

بلک ہارڈٹ دو قسم کی ریاستوں کا نظریہ پیش کرتا ہے: ایک عظیم یا بڑی ریاست، جو خارجی لحاظ سے اعلیٰ مقاصد کو پورا کرتی ہے اور کچھ ثقافتوں کی حفاظت و نگہداشت کرتی ہے۔ یہ ریاست معاشرے کے غیر متحرک طبقہ کو آگے بڑھاتی ہے اور مجموعی طور پر معاشرے کی صلاحیتوں کو پروان چڑھا کر ایسے فعال معاشرہ بناتی ہے۔

اس کے مقابلہ میں چھوٹی ریاستیں صرف اس جگہ اور ماحول میں اپنا وجود برقرار رکھ سکتی ہیں جہاں آبادی کے بڑے حصے کو شہری حقوق ملے ہیں، یہ درجہ یونانیوں کی ریاستوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں تقریباً حاصل کر لیا تھا اور غلامی کے نظام کے باوجود آج کل کی جمہوری حکومتوں سے بہتر تھیں۔ چھوٹی بادشاہتیں بھی ان شرائط کو پورا کر لیتی ہیں، لیکن چھوٹی آمرانہ حکومتیں جو اٹلی میں تحریک نشاۃ ثانیہ کے وقت تھیں وہ ریاست کی سب سے غیر محفوظ طرز حکومت ہوتی ہیں۔

چھوٹی ریاستیں ہمیشہ بڑی ریاست میں ضم ہونے پر تیار رہتی ہیں، کیونکہ چھوٹی ریاستیں جو حقیقی و صحیح آزادی حاصل کر لیتی ہیں، اسلیئے بڑی ریاست کی طاقت انھیں اپنے میں ضم کر کے آزادی و طاقت کا توازن پیدا کرتی ہے۔

ریاست کی ابتداء کیسے ہی ہوئی ہو، لیکن وہ اپنی زندگی صرف اسی وقت برقرار رکھ سکتی ہے جب اس کی بنیاد اور قوت میں استحکام ہو۔ ہر قوت جب استحکام کی خاطر خارجی و داخلی طور سے تکمیل چاہتی ہے تو وہ کمزور کے حقوق کا کوئی پاس نہیں کرتی۔ اس عمل میں "عوام" اور "خاندان"

ایک ہی طریقہ پر چلتے ہیں۔ عوام کی صورت میں ان کی خواہشات فیصلہ کن موڑ میں ظاہر ہوتی ہیں، اور خاندان کی صورت میں، اس کی خواہشات ریاست کی ضرورت ہوتی ہیں۔ اس لئے ریاست کی وسعت کو فتوحات کی لالچ نہیں بلکہ ضرورت کہا جاتا ہے۔ اس کی مثال کارو لنجین شہنشاہیت کی ہے۔

داخلی امور میں، طاقت، حقوق کو ختم کر کے اپنا اثر و رسوخ بڑھاتی ہے اور اس کا جواز عوام کی بہبود بتایا جاتا ہے جب "ریاست میں خود ہوں" کا فقرہ اس ذہن کی پوری پوری عکاسی کرتا ہے اور اس قسم کا طرزِ عمل پرانے بادشاہوں میں مکمل طور پر جلوہ گر نظر آتا ہے جنہوں نے فتوحات کیں، قتل و غارت گری، لوٹ مار اور تباہی کی ہولناک مثالیں قائم کیں اور جب یہ غلاموں کی طویل قطاریں اور مالِ غنیمت کے بوجھ سے لدی ہوئی گاڑیاں اور جانور لائے اور اس شان سے تھیبس یا نینوا میں داخل ہوئے تو لوگوں نے انہیں خدا کا پسندیدہ بندہ کہا۔

جب مورخ لوئی شانزدہم، نپولین اور مقبول انقلابی حکومتوں کا مطالعہ اور تجزیہ کرتا ہے تو اس کو پتہ چلتا ہے کہ "طاقت" برائی اور شر ہے کیونکہ یہ افراد کی خودداری اور انا کو چھین کر ریاست کو دے دیتی ہے اور حکومت ریاست کی انا کی تسکین کی خاطر کمزور ہمسایہ ریاستوں کو غلام بناتی ہے اور انہیں آزادی سے محروم کرتی ہے۔ اس کا جواز یہ دیا جاتا ہے کہ دوسری ریاستوں کو ابھرنے کا اور طاقتور بننے کا موقع نہیں دیا جائے، اگر دوسری ریاستوں کو یہ موقع مل گیا تو وہ اپنی سیاسی فرد ریاست کے تحت دوسروں کو غلام بنائیں گی۔ جب فتوحات کا یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے تو پھر اس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی اور مستقل فتوحات کی بھوک ہر چیز کو

ہڑپ کر لیتی ہے، جو آسانی سے اس کے قبضہ میں آ جائے۔ چھوٹی ریاستیں جو آزادی کے بغیر ہوتی ہیں وہ اتحاد کی خواہش میں فاتح ریاست میں مل جاتی ہیں کیونکہ اس طرح ان کی صنعتی و فنی و معاشی ترقی میں اضافہ ہوتا ہے۔

"برے عمل معصومیت سے کئے جاتے ہیں" اور آدمی اس طاقت سے شرمندہ ہوتا ہے جسے حاصل کرنے کیلئے اس نے یہ تمام جرائم کئے ہوں، اس لئے وہ قانون کی بالادستی قائم رکھنا چاہتا ہے۔ فریڈرک دوم نے پہلی سیلشیسن جنگ میں جو کچھ کیا، اس عمل سے "غیر قانونی وجود" کی مجبوری پیدا ہوئی۔

بک ہارڈٹ اس بات پر زور دیتا ہے کہ ریاست کے داخلی نظام سیاست میں ضروری ہے کہ ہر فرد اپنی خواہش اور رائے کو اس میں ضم کردے۔ اس صورت میں شہریوں میں فرائض کا احساس ہوگا اور ان میں جذبۂ حب الوطنی پیدا ہوگا۔

اس کے نزدیک جب کبھی ریاست اخلاقی مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے تو یہ اس کی کمزوری کی نشانی ہوتی ہے۔ کیونکہ ریاست حق اور خیر کا معیار تو ہو سکتی ہے لیکن اس سے زیادہ نہیں۔ اگر وہ اخلاقی قدروں کو عمل میں لانے کی کوشش کرے گی، تو یقیناً ان صدمات سے دوچار ہوگی کیونکہ اخلاق کا شعبہ ریاست کی حدود سے باہر ہے۔ ریاست کا فرض یہ ہے کہ وہ قانون کی بالادستی قائم رکھے، اور اس بات کو دیکھے کہ اس کے افراد ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائیں۔

ریاست کو جماعتوں سے بالاتر ہونا چاہئے، اس حقیقت کے باوجود کہ ہر جماعت ریاست کو اپنی طاقت میں لانا چاہتی ہے۔

تاریخ کے عمل کا دوسرا پہلو مذہب ہے۔ اس پر بحث کرتے ہوئے کہ مذاہب کی ابتداء کس طرح سے ہوئی، بک ہارڈٹ مختلف نظریات پیش کرتا ہے مثلاً: ایک طبقہ کا یہ خیال ہے کہ خوف نے دیوتاؤں کو جنم دیا۔ اس کے ثبوت میں وہ قدیم قبائل، ان کی زندگی، اور ان کی پوجا و پرستش کے طریقوں سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ انسان نے فطرت کے مظاہر سے ڈر کر دیوتاؤں کو تخلیق کیا۔ اس لئے فطرت کے مظاہر، اجداد اور اشیاء کی پرستش، یہ سب اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ انسان اپنے جذبات کو اس شے سے ظاہر کرتا ہے، جس سے اس کا ذاتی تعلق ہوتا ہے۔

یہ انسانی ذہن کی مجبوری ہے کہ وہ ایک عظیم قوت کے تابع ہونے کے جذبات رکھتا ہے اور ڈر اور خوف کی وجہ سے وہ قربانی، نذر نیاز اور بھینٹ کا سہارا لیتا ہے تاکہ وہ اس عظیم قوت کی خوشنودی حاصل کر سکے۔

مذہبوں کی پیدائش میں ایک چیز یقینی ہے کہ اس کی تخلیق کسی سازگار لمحہ میں کسی ایک فرد کی کوششوں کی وجہ سے ہوئی۔ دوسرے لوگوں نے مذہب کو اس لئے قبول کیا کہ اس کا بانی یا مذہب کی تعلیمات ان کی اس الہیاتی ضرورت کو پورا کرتی ہیں جو انسانی روح میں بے قرار رہتی ہے اور عوام اس شدید ضرورت کی مزاحمت نہیں کر سکتے، اس لئے ان کے نزدیک یہ یقینی چیز ایک غیر یقینی ہیجان پر فوقیت رکھتی ہے۔ اس لئے عوام مذہب کی ظاہری شکل و صورت کو برقرار رکھتے ہیں، جب کہ اس کی روح ان کیلئے ایک بند کتاب کی سی ہوتی ہے۔ یہ اس حالت میں اس وقت تک رہتے ہیں جب تک کہ کوئی دوسرا مذہب، جو پہلے سے زیادہ طاقتور ہو، ان کیلئے پناہ گاہ نہ بنے۔

بک ہارڈٹ مذہب کو دو قسموں میں تقسیم کرتا ہے : قومی اور عالمی مذاہب۔
قومی مذہب کی ابتداء پہلے ہوتی ہے اور اس کی بنیادیں ثقافت، تاریخ
اور معاشرتی اقدار ہوتی ہیں۔ اس کے دیوتا اپنی قوم کو محفوظ رکھتے ہوئے
دوسری قوموں کے لئے عذاب کا باعث ہوتے ہیں۔ جب تک قوم میں
ترقی کے جذبات ہوتے ہیں، مذہب کا لب و لہجہ بلند ہوتا ہے اور یہ
یقین دلایا جاتا ہے کہ ایک دن تمام قومیں اس کے دائرے اثر میں آجائیں
گی۔ جیسے یہودی کہتے تھے کہ:

تمام قومیں موریا کے پہاڑ پر یہوہ کی عبادت کریں گی۔

لیکن یہ مذہب ایک قوم میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی مقدس
زبان اپنے دائرے کو گھٹا لیتی ہے، جس کی وجہ سے دوسری قوموں سے
کوئی رشتہ قائم نہیں ہوتا۔

اس کے مقابلہ میں عالمی مذاہب جن میں بدھ مت، عیسائیت، اور اسلام
قابل ذکر ہیں۔ قومی مذاہب کے مقابلہ میں یہ ارفع و اعلیٰ ہوتے ہیں، ان
کا دائرہ عمل بھی وسیع ہوتا ہے۔ یہ سماجی و طبقاتی تقسیم کے خلاف آواز
بلند کرتے ہیں اور غریبوں و غلاموں کے حقوق کیلئے جنگ کرتے ہیں۔
یہی خصوصیت انہیں بین الاقوامی بناتی ہے۔

بک ہارڈٹ کے نزدیک مذہب کے زوال کی وجہ مقدس قانون ہوتا ہے جو
پوری زندگی پر حاوی ہو کر ریاست کے برابر اپنا اقتدار حاصل کر لیتا ہے۔
جب مذہبی اقدار، سیکولر اقدار سے ملتی ہیں تو مذہب کی ظاہری شکل باقی
رہ جاتی ہے۔ اور اس کی روح ختم ہو جاتی ہے۔ ایک قدیم درخت جو
پتیوں میں گھرا ہوا، گھنا اور خوبصورت معلوم ہوتا ہے، لیکن اندر
سے یہ کھوکھلا ہوتا ہے۔

جس وقت مذہب یہ شکل اختیار کرتا ہے تو اس وقت ایک طبقہ انسانی ضروریات کے شدید احساسات کے تحت اصلاحی مذہبی تحریک شروع کرتا ہے۔ روح کی یہ انفرادی اور تخلیقی جدوجہد تاریخ میں ناکام رہی ہے۔ جیسے ساسانی دور میں مزدک کی تحریک۔ جب بھی معاشرے میں یہ اصلاحی تحریک ابھرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مذہب میں وہ روح، زندگی اور اقدار باقی نہیں رہیں جو معاشرے کی انسانی ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔

مذہب کے دائرۂ عمل میں قتل و غارتگری بھی آتی ہے۔ ان میں سب سے پہلے منکر آتے ہیں، کیونکہ مذہب کے ماننے والے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا سے انکار کے معنی خدا کو قہر اور غضب کو دعوت دینے کے برابر ہے، اس لئے منکر اور مرتد کا قتل ضروری ہے۔ تاکہ معاشرہ خدا کے عذاب سے بچ سکے۔ مذہب نفرت اور دشمنی کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ ثمرند مذہب میں اگرچہ کسی کو داخل نہیں کیا جاتا، لیکن ہر اس شخص سے اور ہر اس اقدار سے نفرت کی جاتی تھی جو اس مذہب کے دائرے سے باہر تھی۔ یہ نفرت اس قدر بڑھتی ہے کہ مختلف مذاہب ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو تباہ کرنا باعث برکت اور دیوتاؤں کی خوشنودی گردانتے ہیں۔ کم بے سس نے مصر کے مندروں کو تباہ کر دیا اور اے پس کے بیل کو مار ڈالا۔ ایکزرکسس نے یونان کی مقدس جگہوں کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ ان سب کے پیچھے اپنے مذہب سے محبت اور دوسرے مذہبوں سے نفرت تھی۔

مذہب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں باغیوں، بدعتیوں، مشرکوں، اور منکروں کو سخت سزا دی جاتی ہے۔ وہ لوگ دنیا میں انھیں زندہ جلا

دیتے ہیں، جو دوسری دنیا میں بھی جلیں گے۔" مذہب کے ماننے والے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انہیں سزا دینی ضروری ہے اس لئے کہ ان کے اعمال سے اور ان کی باتوں سے معصوم ذہن متاثر نہ ہوں۔ اس لئے سینٹ آگسٹن نے جب ڈوناٹسٹس کے قتل کا فیصلہ کیا تو کہا: "تمہیں ہم نہیں تمہارے اعمال قتل کر رہے ہیں، جنہوں نے تمہیں چرچ سے باغی کیا"۔ اسی جذبہ کے تحت انوسینٹ دوم نے تمام عیسائی حکمرانوں کو یہ حکم دیا کہ وہ کافروں کے خلاف جہاد کریں۔

لیکن اس مذہبی جنون اور نفرت نے اپنا انتقام لیا۔ چرچ کی حیثیت پولیس تھانہ کی ہو گئی، اور اس کے عہدیدار پولیس افسر۔ اس کے ردِ عمل کے طور پر مذہبی اصلاح کی تحریکیں ابھریں اور اٹھارویں صدی کی مختلف ذہنی تحریکوں اور ریاست کے نئے نظریوں نے اس کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔

مذہب کے زوال میں جو دوسرے عناصر عمل پذیر ہوتے ہیں ان میں داخلی تفرقات اور تعلیم یافتہ طبقہ کی علیحدگی قابلِ ذکر ہیں۔ وہ مذہب جس نے ارتقائی منازل کو طے کیا ہو وہ دوسرے مذاہب کی نسبت ابدی ہوتا ہے۔ ابدی ان معنوں میں کہ جب تک لوگ اسے مانتے رہیں۔ جب مذہب کے مخالف ریاست کی طاقت کو اس کے خلاف صف آرا کر دیتے ہیں تو مذہب اس طاقت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ اگر یہ طاقت نہ ہو تو مذہب اپنا وجود برقرار رکھ سکتا ہے۔ اگر مذہب سیکولر طاقت کی مدد حاصل کرے تو اس کی مدد سے وہ دوبارہ اقتدار حاصل کر لیتا ہے جیسے ہندوستان میں برہمن مت نے بدھ مت کو ختم کر کے اپنا اثر پھر سے قائم کر لیا۔

بک ہارڈٹ مذہب کے استحکام اور قیام میں ریاست کی طاقت اور حکمرانوں کے شاہی قوانین کو انتہائی اہم سمجھتا ہے۔ اگر کانسٹنٹائن سے لیکر

تھیوڈوسس تک شاہی قانون نہیں ہوتے تو یونانی و رومی مذاہب زندہ رہتے۔ اسی طرح اگر تحریک اصلاحِ مذہب (Reformation) کے پیچھے حکمرانوں کی مدد نہیں ہوتی تو اس کا بھی وجود نہیں ہوتا۔

تاریخ کا تیسرا پہلو کلچر ہے۔ برک ہارڈٹ کلچر کی تخلیق کو انسانی ذہن کی "اچانک تخلیقات" کہتا ہے، کیونکہ اس کی ابتداء اچانک ہوتی ہے۔ اس میں نظم و ضبط اور ترتیب جب آتی ہے جب سائنس اور فلسفہ میں ترقی ہوتی ہے۔ ریاست اور مذہب کی طرح کلچر کا بھی ہر پہلو نشوونما اور شباب کے بعد زوال پذیر ہو جاتا ہے اور آخر میں روایات کے ذخیرے میں اس کا نام باقی رہ جاتا ہے۔

کلچر کی ابتداء ذہن سے ہوتی ہے جو غور و فکر کرتا ہے اور اس فکر کو زبان میں ڈھالتا ہے۔ زبان کے وسیلہ سے فکر کا اظہار کیا جاتا ہے اس لئے زبان کسی قوم کی روح کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتی ہے، کیونکہ زبان ہی میں قوم کی تاریخ، بزرگوں کے اقوال، شاعروں اور فلسفیوں کے افکار ہوتے ہیں۔ جو زبان سب سے پرانی ہوگی، اسی قدر زرخیز ہوگی، کیونکہ ہر زبان کے دورِ انحطاط میں بہترین ادب تخلیق ہوتا ہے۔ لاسا کے نظریہ کے تحت کلچر کے ارتقاء میں یہ درجات ہوتے ہیں: کان کنی، دھات سے ہتھیار بنانا، جانور پالنا، زراعت، جہاز رانی، تجارت، صنعت، مادی ترقی، اس کے بعد آرٹ دستکاری میں ظاہر ہوتا ہے، پھر آرٹ سے سائنس پیدا ہوتی ہے۔

آرٹ سائنس سے زیادہ پیچیدہ اور روح کی سب سے حیرت ناک تخلیق ہے۔ آرٹ، شاعری، اور موسیقی یہ سب مذہبی رسومات

کی شکل میں ظاہر ہوئے اور پھر ان میں ترقی ہوئی۔ اس کے مقابلہ میں سائنس عملی ضروریات کا روحانی پہلو ہے۔

"Spritual aspect Of Practicle necessity"

اور لامحدود اشیا کی ترتیب و تدوین کا ذریعہ ہے۔ سائنس اشیا کے راز سے پردہ اٹھاتی ہے اور ان کے عمل کو ظاہر کرتی ہے جب کہ فلسفہ تمام اشیا کے قانون کی تہہ تک پہونچ جاتا ہے۔

آرٹ نہ تو کسی شے کا کوئی قانون دریافت کرتا ہے اور نہ اشیا کی ترتیب و تدوین میں حصہ لیتا ہے بلکہ یہ ایک اعلیٰ زندگی کی تخلیق کرتا ہے جس کا وجود اس کے بغیر ممکن نہیں۔ آرٹ پر اسرار پردوں کے ذریعہ روح سے تعلق قائم کرتا ہے۔ وہ اس دنیا، وقت اور فطرت سے خیالات و تصورات حاصل کرتا ہے اور انھیں آفاقی شکل میں ڈھال کر ابدی بنا دیتا ہے۔ یہ خیالات جو اپنے زمانہ سے پیدا ہوتے ہیں اور ہر آنیوالے زمانہ کو متاثر کرتے ہیں۔ فن تعمیر میں صلاحیتیں اپنی تخلیقی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں اور اس کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے کہ صحیح آرٹ کیا ہے؟ اگرچہ فن تعمیر میں مقصدیت کو پورا پورا دخل ہوتا ہے، اور اس میں آرٹ کی ایک شکل بار بار روایتی انداز میں دھرائی بھی جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود اس میں زمانہ کی پوری اقدار ضم ہو جاتی ہیں۔

ابتدا میں آرٹ مذہب کے زیر اثر رہا، لیکن آرٹ نے مذہب کی زیر نگرانی کبھی اعلیٰ مقام حاصل نہیں کیا، کیونکہ مذہب انسان کی الہیاتی ضرورت پیدا کرتا ہے جو آرٹ کی محسوسات کے بغیر بھی ہو سکتی ہیں۔ اس لئے آرٹ کے بارے میں مذہب کا معاندانہ رویہ رہا ہے۔

آرٹ ہر شکل میں تحریک پیدا کرتا ہے۔ لیکن جو آرٹ محسوسات اور

خیالات سے زیادہ واقعات میں جکڑ جاتا ہے، وختم ہو جاتا ہے۔ مثلاً: شاعری ایک نئی دنیا پیدا کرتی ہے، وہ موجودہ واقعات کو بیان نہیں کرتی۔ اسی لئے شاعری اور فلسفہ میں تضاد ہے۔

بک ہارڈٹ کلچر کے اثر ونفوذ کا ذریعہ تجارت کو بتاتا ہے۔ ایک انتہائی ترقی یافتہ معاشرہ اپنی صنعت وحرفت کے ذریعہ کلچر کو دوسروں تک پہونچاتا ہے؛ جیسے اٹرسکن اور پونٹک یونان کی خوبصورت چیزوں کو خریدتے تھے۔ انھیں اپنے پاس رکھنے کی وجہ سے ان کا یونان سے ذہنی تعلق پیدا ہوا۔ کلچر کے اس اثر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسری اقوام میں اس سے کوشش کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہنے لگتے ہیں کہ "ایسا ہم بھی کر سکتے ہیں"۔ اس باہمی تعلق سے مختلف مہذب اور ترقی یافتہ معاشرے ایک ہی معیار اور سطح کی اشیا تخلیق کرتے ہیں۔ کلچر ذہنی بلندی پر پہونچ کر کسی مرکز پر جمع ہو جاتا ہے جیسے ایتھنز اور فلورنس۔ یہ مرکز کلچر میں علاقائی تعصب کو پیدا کرتا ہے یہاں تک کہ ان میں یہ تفخر پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ ہر کام کر سکتے ہیں، اسی جذبہ کے تحت وہ دوسروں سے علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں۔ اگرچہ وہ ٹکنالوجی اور صنعت وحرفت میں کمال حاصل کر لیتے ہیں، لیکن روحانی اعتبار سے وہ جمود اور تنگ نظری کی جانب چلے جاتے ہیں۔

کلچر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ معاشرے کے تمام افراد کی سرگرمیوں کو ایک زنجیر میں جکڑے رکھتا ہے، چاہے وہ اعلیٰ ذہن کی تخلیق ہوں یا معمولی کاریگری اور دستکاری کے کام۔ کوئی بھی ایجاد چاہے وہ ذہنی ہو یا روحانی، معاشرے کے ہر فرد کو متاثر کرتی ہے۔

بک ہارڈٹ ایک عظیم کلچر کی خصوصیت بتاتا ہے کہ اس کا دوبارہ

احیاء ہو سکتا ہے، اور آنیوالی نسلیں اسے یا تو ورثہ کے طور پر یا اس کے قابل قدر اوصاف سے متاثر ہو کر اسے پورا یا تھوڑا بہت اختیار کر لیتی ہیں۔ عام طور سے سیاسی اور مذہبی کلچر کا احیاء ساتھ ساتھ نہیں ہوتا لیکن شارلیمین کے زمانہ میں ان دونوں کا احیاء ہوا۔ رومی شہنشاہیت اور قدیم رومی آرٹ و ادب دوبارہ سے مقبول ہوئے۔ اس کے علاوہ تاریخ میں مختلف کلچروں کا احیاء ہوا، مثلاً جلاوطنی کے بعد یہودیت کا احیاء اور ساسانیوں کے زمانہ میں ایرانی شہنشاہیت کا احیاء لیکن اس کی زندہ مثال تحریک نشاۃ ثانیہ ہے، جس نے اٹلی کے حدود دیدالوں سے نکل کر یورپی شکل اختیار کی۔

بکسہارڈٹ اپنے زمانہ کے کلچر کو، یعنی انیسویں صدی کو اس لحاظ سے فوقیت دیتا ہے کہ اس میں تمام زمانوں، قوموں، اور کلچروں کی روایات، اقدار، اور افکار ذخیرہ کی شکل میں موجود ہیں۔ اس لئے انیسویں صدی کا ادب دنیا کا ادب ہے۔ دنیا کا ہر شخص آزاد ہے کہ وہ دنیا کے ہر علاقے کی روایات کو اختیار کرے، کیونکہ ریاست اور چرچ (مذہب) اب اس کی راہ میں حائل نہیں۔

دنیا کی تاریخ پر سکون اور خاموش نہیں، اس میں تلاطم و شور، ہنگامہ و انقلاب، تراش و خراش، اور شکست و ریخت ہے۔ فطرت بے چین ہے اور فطرت کی بے چینی قوموں میں تبدیلیاں لاتی رہتی ہے۔ نظریات و خیالات، مقصدِ زندگی، مسلکِ حیات، طریقۂ کار و عمل، استحکامِ حکومت و اخلاقی اقدار ہر چیز ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ کی جانب رواں دواں رہتی ہے۔ قومیں نئے نئے بحرانوں کا شکار ہوتی ہیں،

انقلابات آتے ہیں اور اس انتشار و خلفشار سے ایک نئی زندگی، نیا ماحول اور نئی اقدار پیدا ہوتی ہیں۔

بک ہارڈٹ کے نزدیک یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنی ذہنی ترقی کو اسی وقت تکمیل کی جانب لے جا سکتا ہے جب وہ دوسروں سے اپنا تقابل کرے

قوم میں طاقت کا احساس اسی وقت ہوتا ہے جب وہ حالتِ جنگ میں ہو، کیونکہ اس کی طاقت اسی وقت وجود میں آتی ہے۔ اس لئے قوم کی زندگی میں جنگ اہمیت کی حامل ہے۔ ہیراکلیٹس جنگ کو تمام چیزوں کا بانی قرار دیتا ہے۔ اور لاسا (Lasu) مخالفت کو تمام ترقی کی بنیاد سمجھتا ہے۔ جنگ دراصل ایک فطری اور عالمی قانون ہے جو ہر شے میں، ہر جگہ، اور ہر ماحول میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ اس لئے بک ہارڈٹ جنگ کو ایک صحت مند معاشرے کیلئے ضروری سمجھتا ہے۔ کیونکہ یہ قوم میں بہادری، حق گوئی، اور اتحاد پیدا کرتی ہے۔ لیو (Leo) جنگ کو ایک وہ فرحت بخش ذریعہ بتاتا ہے جو گھٹیا اور کمزور کو ختم کر دیتی ہے۔ طویل امن ہمیشہ جسمانی کمزوری کا باعث ہوتی ہے اور اس دور میں خوف زدہ، سہمے ہوئے، اور دہشت زدہ افراد پیدا ہوتے ہیں۔ جو اپنے وجود سے چمٹے رہتے ہیں اور اپنے حقوق کی باتیں کرتے ہیں۔ لائق اور ذہین افراد کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں، اور درحقیقت پوری قوم کے خون کو فاسد کر دیتے ہیں۔ اسی لئے جنگ ضروری ہے تاکہ یہ ناتواں اور منحوس زندگیاں ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائیں۔

جنگ قوم میں نظم و ضبط پیدا کرتی ہے۔ اس بحران پر افراد اور جماعتیں

اپنے اختلافات کو ختم کر کے ایک عظیم مقصد کیلئے اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صرف طاقت کے ذریعے امن برقرار رکھا جا سکتا ہے اور صرف جنگ کی صورت میں اس طاقت کا لوہا منوایا جا سکتا ہے۔ اس لئے امن جنگ میں پوشیدہ ہے۔ اگر جنگ انصاف پر مبنی ہو تو تاریخ میں ہمیشہ انقلاب لاتی ہے۔ جیسے ایرانیوں کی جنگ نے یونانیوں کو متحد اور طاقتور بنا دیا۔ یا اسپین سے جنگ کے بعد نیدرلینڈ نہ صرف آزاد ہوا بلکہ اس میں خود اعتمادی بھی پیدا ہوئی۔

معمولی جھگڑے تاریخ میں کوئی بحران پیدا نہیں کر سکتے، یہ انتہائی بے کسی اور گمنامی سا تھ ختم ہو جاتے ہیں۔ موجودہ زمانے (۱۹ صدی) کی جنگیں بھی صحیح بحران پیدا نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ ان جنگوں کے باوجود شہری زندگی متاثر نہیں ہوتی، دوسرے اب جنگ بہت مختصر وقت کیلئے ہوتی ہے، اس لئے تباہی کی پوری طاقتیں عمل میں نہیں آتیں، جبکہ یہی طاقتیں پرانے نظام کو ختم کر کے نیا نظام پیدا کرتی ہیں۔

برک ہارڈٹ قوم اور معاشرے کے دوسرے بحران کی نشاندہی کرتے ہوئے معاشرے کی طبقاتی کشمکش اور ذات پات کی تفریق کو انتہائی اہمیت دیتا ہے۔ جب معاشرہ ظالم و مظلوم میں بٹ جاتا ہے تو مظلوم طبقہ ہمیشہ ظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ یہ احتجاج مقدس قانون اور اس امتیاز کے خلاف ہوتا ہے جس کا وہ شکار ہوتا ہے۔ اس مرحلہ پر مذہب دونوں جانب سے ساتھ دیتا ہے، اور نئے مذاہب و قوانین اسی بحران سے پیدا ہوتے ہیں۔

یونان کی ریاستیں جن بحرانوں سے گذریں ان میں بادشاہت، امراء کا اقتدار، جمہوریت اور مطلق العنانیت کے مرحلے تھے۔ چونکہ یونان میں ان بحرانوں کا دائرۂ عمل بہت تنگ تھا، اس لئے یہ مقامی تھے، یہاں تک کہ پے لی پونیشین جنگ بھی ایک بڑا قومی بحران ثابت نہیں ہوئی۔ روم میں تمام انقلابات کے باوجود اس بات کی کوشش کی گئی کہ حکومت غلاموں کے ہاتھوں میں نہ جائے اور روم ہمیشہ ایک طاقت سے دوسری طاقت کے ہاتھوں منتقل ہوتا رہے۔ کانسٹنٹائن اور اس کے جانشینوں نے چرچ کے ارتقاء کے دوران شہنشاہیت کو محفوظ رکھا، لیکن جب عیسائیت کا پوری طرح غلبہ ہو گیا تو شہنشاہیت ختم ہو گئی اور ریاست چرچ کے اقتدار میں چلی گئی۔

معاشرے میں بحران کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ بک ہارڈٹ اسے "ماضی کے خلاف احتجاج کہتا ہے" کسی بحران کے پیچھے صرف ایک وجہ نہیں ہوتی بلکہ کئی وجوہات اور تلخیاں اکٹھی ہوتی رہتی ہیں، پھر اس مخالف تحریک میں ہر وہ شخص شامل ہو جاتا ہے جو تبدیلی کا خواہشمند ہوتا ہے۔ یہ تحریک اس مرحلہ پر پہونچ کر بحران پیدا کرتی ہے جہاں ایک نظام موت کیلئے اور دوسرا وجود میں آنیکے لئے بے چین ہوتا ہے۔
اس تحریک میں کچھ شخصیتیں اپنی فصاحت و بلاغت اور ذاتی صلاحیتوں سے ایک نئی روح پیدا کر دیتی ہیں اور تحریک کو صحیح شکل دیتی ہیں۔ اس کے بعد ہی امید کے چہرے سے پردہ اٹھتا ہے اور عوام اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ وہ ماضی کے خلاف احتجاج بھی کرتے ہیں اور مستقبل سے پرامید بھی ہوتے ہیں۔ مستقبل کا یہ درخشاں تصور ۱۷۸۹ء

فرانسیسی انقلاب کے انتخابی منشوروں میں پوری طرح نمایاں ہے اور روسو کا یہ قول کہ انسان فطرتاً نیک ہے ان کیلئے راہنمائی کا باعث تھا۔ لیکن خوشی و مسرت کا پیغام لانیوالا یہ بحران ۱۷۹۵ء میں شان دو مار (Champs de Mars) کے قتل عام پر ختم ہوا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آدمی کی فطرت ایسے موقعوں پر اپنی ساری امیدیں طاقت کے سپرد کر دیتی ہے۔

بحران پہلے مخالفت کی شکل میں ابھرتے ہیں، یہ مخالفت ان کی کسوٹی ہوتی ہے۔ کیونکہ یہاں کمزور اور کم طاقت والی تحریکیں ختم ہو جاتی ہیں اور صرف وہ تحریکیں ابھرتی ہیں جن میں شدت اور مخالفت ہوتی ہے۔ اگر کسی سازگار لمحہ کے وقت بحران ٹل جاتا ہے اور عمل میں نہیں آتا تو یہ اس کیلئے بہتر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی مخالف قوتیں اسے تباہ کرنیکا ارادہ کرتی ہیں۔ اگر کسی تحریک کی زیادہ مخالفت کی جائے، تو اسے اور مضبوط اور طاقتور بناتی ہے۔ سرکاری تحریک کے میدان قومی اسمبلیاں ہوتی ہیں، لیکن یہ بہت جلد بیکار ہو جاتی ہیں، یہ یا تو کسی طاقتور شخصیت کے ہاتھوں غلام بن جاتی ہیں جیسے ۱۸۱۵ء میں نپولین نے فرانس کی اسمبلیوں کو اپنا تابع بنالیا تھا۔ یا پھر یہ با اقتدار جماعت کے مفاد کا تحفظ کرتی ہیں۔

تحریک جب پرانے نظام کو ختم کر کے نیا نظام قائم کرتی ہے تو پرانے نظام کے حامی ختم کر دئے جاتے ہیں۔ تحریک کے وہ راہنما جنھوں نے اسے کامیابی تک پہونچایا تھا، انھیں تحریک کی قیادت سے محروم کر دیا جاتا ہے کیونکہ ان کے خیالات رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتے اس لئے تحریک ہر لمحہ اور موڑ پر اپنے صحیح نمائندے منتخب کرتی ہے۔ بعض اوقات تحریک کے بانی اپنے ذہن میں بعض تصورات کر لئے اپنی فصاحت

سے عوام کے جذبات کو بھڑکا کر اس مقام پر پہونچ جاتے ہیں، جس کے وہ اہل نہیں ہوتے ۔ اس لئے یہ لوگ تحریک کا تیزی سے ساتھ نہیں دے سکتے۔ اور اسی تیزی کے ساتھ انہیں بدل دیا جاتا ہے، اور دوسری نسل ان کی جگہ لے لیتی ہے۔

تحریک کی مخالف قوتوں میں وہ تمام اقدار اور قانون ہوتے ہیں جو اخلاقی اور ثقافتی لحاظ سے معاشرے میں گہری جڑیں رکھتے ہیں۔ اس لئے ان اقدار کے قیام اور استحکام کیلئے معاشرہ پوری جدوجہد کرتا ہے۔ یونان میں پے لی پونیشین جنگ کے بعد سیاسی زوال ہوا تو اس نے انتشار اور بے چینی پیدا کی ۔ کورسے را (Corcyra) کے مظالم نے ردعمل کے طور پر تمام یونان کو بیدار کر دیا، جس کی وجہ سے دو مخالف قوتوں کا تصادم لازمی ہوا ۔ عوام نے خفیہ جماعتیں بنا کر قانون کی مخالفت کی ۔ رقابت، دشمنی، نفرت و عداوت دونوں طرف سے شدید صورت میں ظاہر ہوئیں ۔ اس میں بیٹوں اور وارثوں تک کا خیال نہیں کیا گیا جب کوئی معاشرہ اس بحران سے دوچار ہوتا ہے تو اس وقت وہاں دہشت پسندی کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس میں ایک طرف تو خاص خاص لوگوں کو چن کر قتل کیا جاتا ہے جو معاشرے کے استحکام کو متاثر کرتا ہے اور دوسری جانب اچانک عوام کا قتلِ عام ہوتا ہے جیسے یونان اور اٹلی کی ریاستوں میں ہوا۔

اس موقع پر سب سے زیادہ خفقہ وطن سے بھاگ جانیوالوں پر ہوتا ہے جب گرانڈ ڈیوک کوسی مو" اور "فرانسسکو میڈیسن" نے ان لوگوں کو زہر دلوایا تو تمام دنیا نے ان کے اس ظالمانہ رویہ پر احتجاج کیا۔ لیکن جب جمہوری ریاستوں نے ان کے رشتہ داروں کو قتل کرایا

تو اسے سیاسی مصلحت قرار دیا گیا۔

اس دہشت خیز بحران کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ بحران اپنی شدت اور اپنے ہی ظلم کی آگ میں جل کر ختم ہو جاتا ہے۔ بحران کے ہر موڑ پر لیڈروں کو "اعتدال پسند" کہہ کر انھیں ختم کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح بحران اپنے ہی ردعمل کا شکار ہو کر صدمہ اٹھاتا ہے۔ بحران میں جو شدید زیادتیاں کی جاتی ہیں وہ اعتدال پسند افراد کو تھکا دیتی ہیں۔ عوام جو ابتداء میں پرجوش ہوتے ہیں آہستہ آہستہ لاتعلقی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ چونکہ دیہاتی آبادی کو اس تحریک میں شریک نہیں کیا جاتا، اس لئے وہ اس کے مقاصد سے بالکل نابلد ہوتے ہیں۔ جیسے چوتھی صدی میں رومی نوآباد۔یات والوں سے نہیں پوچھا گیا کہ کیا وہ عیسائی ہونا چاہتے ہیں؟ اور نہ ہی چھٹی صدی میں پولینڈ والوں سے کہ کیا وہ کیتھولک مذہب اختیار کرنا چاہتے ہیں؟ ہر موقع پر ان کے جاگیرداروں نے ان کی جانب سے فیصلہ منظور کر لیا۔

تحریک جب ایک بار تباہی و بربادی کے ہتھیاروں کو استعمال کرتی ہے تو اس کے نتیجہ میں وہ تمام خفیہ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جو اس انتشار میں اپنا حصّہ بٹورتی ہیں، اور تحریک کو اس کے آئیڈیل کے ہڑپ کر جاتی ہیں۔ تحریک کے تمام رہنما ہر مرحلہ پر تختۂ دار پر چڑھائے جاتے ہیں اور ان کی جگہ لینے والی جماعت کم حیثیت اور کم مرتبہ ہوتی ہے۔ آخر میں تحریک کے رہنما ہی بدل جاتے ہیں، کچھ عیش و عشرت کو اختیار کر لیتے ہیں، اور کچھ اپنی زندگی بچانے کی خاطر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ ان تمام وجوہات کی وجہ سے تحریک کی رفتار مدہم ہو جاتی ہے اور اگر رفتار میں تیزی ہوتی ہے تو اسی تیزی میں گر کر ختم ہو جاتی ہے۔ مثلاً تحریکِ اصلاحِ مذہب

سنہ ۱۵۲۴ء تک مقبولِ عام تھی، کسانوں کی جنگ نے اسے مزید طاقتور بنایا، لیکن اس جنگ کی تباہی نے تحریک کو نقصان پہونچایا۔ جنوبی جرمنی میں جہاں یہ تحریک کامیاب رہی اس کا فائدہ وہاں کی حکومتوں نے اٹھایا۔ شمالی جرمنی میں اس کی وجہ سے کیتھولک مذہب کو استحکام ملا

تحریک کے خاتمہ کے بعد جب معاشرہ مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے تو وہ حکومت کے ان مظالم کو خاموشی سے برداشت کرتا ہے جنھوں نے بحران پیدا کیا تھا۔ انگلستان میں پریسں بائیٹیرین نے چارلس کی مدد کی تھی، لیکن اس کی حکومت میں ان ہی پر ظلم کئے گئے اور انھوں نے یہ برداشت بھی کئے۔

بحران کا ایک مرحلہ وہ ہوتا ہے جہاں دولت کی تقسیم اور جائیداد کا مسئلہ آتا ہے، کیونکہ کچھ باصلاحیت اور ذہین افراد بحران کے دوران دولت جمع کرتے ہیں اور پھر اس دولت سے کسی ایسی جماعت کو طاقتور بناتے ہیں جو ان کی جائیداد کی حفاظت کرے۔ چنانچہ ہر تحریک کے پس منظر میں وہ طبقہ ہوتا ہے جو جائداد حاصل کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ تحریک اصلاح مذہب کے پیچھے بھی چرچ کی جائداد کا چکر تھا۔ جب یہ طبقہ جائداد پر قابض ہو جاتا ہے تو پھر اس کے استحکام کی کوشش کرتا ہے۔ اسی لئے ۱۷۹۰ء میں فرانس کے نئے جاگیردار انقلاب کے خاتمہ کے حامی تھے، اور ایک مطلق العنان حکومت کے خواہش مند تھے جو ان کے مالِ غنیمت کو بچائے رکھے۔ یہی کچھ البی جینیشین (Albigensian War) جنگ میں ہوا۔ جبکہ ۱۲۰۳ جاگیرداروں نے اپنے مفاد کی خاطر کونٹ طولوس کو طاقت حاصل نہیں کرنے دی، جو بدعت کے خلاف اٹھ رہا تھا۔ کیونکہ وہ اس بات سے قطعی لاتعلق تھے ان کے کسان البی جینیشین رہیں یا

یا کیتھولک، وہ صرف اپنی جائداد کا تحفظ چاہتے تھے۔

تحریک کی کامیابی کے بعد معاشرے کے کچھ طبقوں یا ملک کے کچھ حصوں سے اس کے خلاف بغاوت ہوتی ہے۔ تحریک کی کامیابی کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ ان باغیوں کو کچلا جائے، اس لئے کرام ویل نے آئرلینڈ سے جنگ کی، اور فرانس نے انقلاب کے دوران باغیوں سے انتقام لیا۔ جب ملک پر بیرونی حملوں کا خطرہ ہوتا ہے تو فوج کو دفاع کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جیسے ۱۷۹۲ء میں اتحادیوں کے خلاف فرانس نے فوج تیار کی، لیکن اندرونی اور بیرونی خطرات بحران کو دہشت پسند بنا دیتے ہیں، اس کا شکار سب سے پہلے فوج کے جنرل ہوتے ہیں جیسے ۱۷۹۲-۹۳ء میں فرانس میں ہر اس جرنل کا گلا کاٹ دیا جاتا تھا جو ناکام ہوتا تھا۔ دہشت پسندی اور انتشار کو ختم کرنے کیلئے ایک اور بحران پیدا ہوتا ہے۔ اس موقع پر جو انقلاب آتے ہیں وہ دستوری اور عوام کی حکومت کو ختم کر دیتے ہیں۔ قوم یا تو اس انقلاب کو خوش آمدید کہتی ہے یا اس سے لاتعلق رہتی ہے۔ جیسے ۴۹ ق م میں سیزر کا انقلاب، ۱۶۵۳ء میں کرام ویل کا اقتدار اور دونوں نپولین کے انقلاب۔ ایسی حکومت ابتداء میں دستور کو تبدیل کرتی ہے۔ جیسے سیزر نے سینیٹ کو زیادہ نشستیں دیں، اور نپولین سوم نے عوام کو حق رائے دہی دیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد یہی حکومت بادشاہت میں بدل جاتی ہے اور ریاست کو بھی اپنے نظریات میں ڈھال لیتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ افراد کی حکومت یا جمہوریت خود دستبردار ہو جاتی ہے اور مطلق العنانیت کو قائم کرنے میں مدد دیتی ہے۔ یونان کی ریاستوں میں ایسا ہی ہوا۔ ہیبریس (Hybreas) نے اینتھوڈیموس سے کہا: اینتھوڈیموس تم ایک لعنت ہو۔ نہ تم ہمارے

ساتھ رہ سکتے ہیں اور نہ تمہارے بغیر" ۔ اسی لئے کرامویل نے اپنے جنرلوں کی مدد سے حکومت کی ۔ اس موقع پر اگر کوئی ملک کو دستور دینے کی کوشش کرتا ہے تو وہ خود ہٹا دیا جاتا ہے ۔ اس کی جگہ آزادی نہیں آتی بلکہ کوئی دوسرا شخص طاقت حاصل کر لیتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ عوام خود بھی آزادی حاصل کرنا نہیں چاہتے ۔

افراد اور قوموں کی زندگی خوشی و مسرت اور رنج و الم سے آلودہ ہوتی ہے خوش قسمتی و بدقسمتی پہلو بہ پہلو اور شانہ بہ شانہ ساتھ ساتھ چلتی ہیں بک ہارڈٹ انسانی تاریخ کے عظیم سلسلہ میں بھی خوش قسمتی و بدقسمتی کے لمحات کو ایک دوسرے سے چمٹا ہوا دیکھتا ہے ۔ ایک قوم کیلئے جو لمحہ خوش قسمت ہوتا ہے وہی دوسری قوم کیلئے بدقسمتی کا باعث بن جاتا ہے ۔ مثلاً:

(۱) یہ خوش قسمتی تھی کہ یونانیوں نے ایران کو فتح کر لیا اور رومیوں نے کارتھیج کو ۔

(۲) یہ بدقسمتی تھی کہ پے لی پونیشین جنگ میں اسپارٹا نے ایتھنز کو شکست دیدی ۔

(۳) یہ بدقسمتی تھی کہ سیزر رومی شہنشاہیت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے سے پہلے قتل کر دیا گیا ۔

(۴) یہ بدقسمتی تھی کہ جرمن قبیلوں کی ہجرت میں انسانی ذہن کی اعلیٰ تخلیقی قوتیں ختم ہو گئیں ، لیکن یہ خوش قسمتی تھی کہ انہوں نے ایک صحت مند نسل دنیا کو دی ۔

(۵) یہ بدقسمتی تھی کہ جرمن شہنشاہ پاپائیت کے مقابلہ میں شکست کھا گئے اور چرچ نے آمرانہ نظام قائم کر لیا ۔

(۶) یہ بدقسمتی تھی کہ تحریک اصلاحِ مذہب آدھے یورپ میں کامیاب رہی اور پروٹسٹنٹ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔

تاریخ میں کسی خاص دور یا زمانہ کو بہترین اور سنہرا کہا جاتا ہے۔ یہاں بھی ہر جماعت و فرد کی رائے میں اختلاف ہوتا ہے۔ مثلاً: پیریکلس کے زمانہ کو یونان کی تاریخ کا سنہرا دور کہا جاتا ہے، کیونکہ اس میں آرٹ و شاعری اعلیٰ درجہ کو پہونچ گئی تھی۔ رینان کے نزدیک ۱۸۱۵ سے لے کر ۱۸۴۸ء تک کا زمانہ فرانس کا بہترین زمانہ تھا۔ برک ہارڈٹ کے نزدیک زمانہ کو اچھا یا برا سمجھنا افراد کے اپنے خیالات، تصورات اور ماحول پر ہوتا ہے۔ کچھ جمہوریت کو اچھا سمجھتے ہیں، کچھ بادشاہت کو، اور کچھ سیاسی انتشار کو۔ لیکن ان سب سے زیادہ جس کی خواہش ہر فرد کو ہوتی ہے وہ یہ کہ معاشرے میں تحفظ ہو اور خصوصیت کے ساتھ مال و جائداد کی حفاظت کی جائے۔ ہمارے زمانہ میں تمام اخلاقی اقدار جائداد کی حفاظت کیلئے تخلیق کی گئیں۔ اور جو چیز ریاست کی حدود سے باہر ہے اسے انشورنس کے ذریعہ پورا کیا گیا۔

برک ہارڈٹ قوم و ملک کی عظمت کو ایک دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ عظمت خوشگوار راستوں سے گذر کر نہیں آتی بلکہ اس کے جلو میں قتل و غارتگری اور مظالم ہوتے ہیں۔ اس لئے ان تمام دکھوں اور تکالیف کو یہ کہکر نظر انداز کر دینا کہ یہ وقتی بدقسمتی تھی، انصاف نہیں۔ تباہی و بربادی کے بعد کی خاموشی کو خوشی و مسرت سے تعبیر کرنا اور اسے عظیم بتانا، حقیقت سے انکار ہے۔ تاریخ میں اس قسم کے فیصلے

دینے والے فخر و غرور سے یہ کہتے ہیں کہ "یہ ہمارا فیصلہ ہے" حالانکہ ان کا فیصلہ ہمیشہ ان کی اپنی پسند یا ناپسند میں محدود ہوتا ہے۔

مسرت کا یہ تصور کہ وہ کسی خاص ماحول اور حالات میں ہوتی ہے غلط ہے۔ جب معاشرہ قدیم طریقہ زندگی سے نکل کر، جس میں اس کیلئے ہر دن اور ہر صدی برابر کی حیثیت رکھتی ہے، تاریخی دور میں آتا ہے تو اس کے بعد وہ ایک مستقل حالت میں نہیں رہتا، کیونکہ جمود اس کیلئے موت کا باعث بن جاتا ہے۔ صرف حرکت تمام دکھوں اور تکالیف کے باوجود اس کی زندگی برقرار رکھتی ہے۔ اس لئے مسرت کا یہ تصور غلط ہو جاتا ہے کہ مسرت نام ہے اس حالت کا کہ جس میں تکلیف نہ ہو۔
لیکن جب معاشرہ اس درجہ پر پہنچ جاتا ہے جو تہذیب و تمدن کی معراج ہوتا ہے تو اپنی تمام روحانی و مادی اقدار کو مقدس سمجھ کر ان کی حفاظت کرتا ہے، اس وقت معاشرہ، عوام، اور زمانہ کا یہ جمود روحانی، ذہنی، اور مادی اقدار کے تحفظ کیلئے ہوتا ہے، تاکہ وہ انہیں بحفاظت مستقبل کے حوالے کر دے۔ اس لئے اس وقت کی یہ خاموشی، موت کی نہیں بلکہ اس نیند کی مانند ہوتی ہے جو ذہن و جسم کو تازگی و شگفتگی بخشتی ہے۔

بک ہارڈٹ تاریخ میں طاقت کو سب سے زیادہ با عمل اور موثر دیکھتا ہے۔ فطرت کے ہر پہلو میں طاقت کمزور کو ہراساں و دہشت زدہ کئے ہوئے اپنے آہنی پنجہ میں جکڑے ہوئے ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں طاقتور ہمیشہ کمزور کو نیست و نابود کرتا، یا انہیں اپنا غلام بنایا کرتا ہے۔ کمزور نسل کی قسمت میں غلامی مقسوم ہے۔ اسی طرح ایک ہی نسل میں

میں کمزوروں کے فرائض میں ہے کہ اپنے سے طاقتور کی خدمت کریں۔

بک ہارڈٹ اس نظریہ کا قایل نہیں کہ ہر تباہی کے بعد تعمیر ہوتی ہے اور ہر خاکستر سے ایک نیا جہان پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح ایک سبز کھیت کو اگر بری طرح سے پامال کر دیا جائے تو ہمیشہ کیلئے بنجر ہو جاتا ہے اسی طرح اگر افراد کو سختی و تشدد سے پوری طرح تباہ و برباد کر دیا جائے تو ان کی تخلیقی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں اور وہ کبھی صحت مند قوم کی شکل میں دوبارہ سے پیدا نہیں ہوتے۔ ایشیا میں اس کی مثال تیمور کی ہے، جس نے ایک لشکر جرار کے ہمراہ فتوحات کا سلسلہ شروع کیا، دشمنوں کے سروں کے مینار تعمیر کئے، لوٹ مار، قتل و غارتگری، تباہی و بربادی، آگ و خون، ظلم اور تکالیف اس کے ساتھ ساتھ چلیں، جہاں جہاں اس کے قدم گئے، وہاں آگ کے شعلوں اور سسکتی ہوئی لاشوں کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ان تمام ملکوں میں جہاں اس نے فتوحات کیں، لوگ انسانی ہمدردی اور محبت کے جذبات سے خالی ہو گئے۔ تیمور اور بایزید کا تصادم تاریخ میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ تیمور کی فتح اور عثمانیوں کی شکست نے ان کی قوت و طاقت کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ وہ جس تیز رفتاری سے یورپ کو فتح کرتے ہوئے بڑھ رہے تھے وہ اچانک رک گئی۔ اگرچہ اس کے بعد بھی سلاطین عثمان یورپ کیلئے ڈر اور خوف کا باعث رہے، لیکن اس کے بعد وہ اپنی اس طاقت کو حاصل نہیں کر سکے جو بایزید کے زمانہ میں تھی۔

بک ہارڈٹ مورخوں کیلئے یہ ضروری سمجھتا ہے کہ وہ تاریخ میں روپوش

اور گمنام آرٹ، ادب، اور شاعری کو تلاش کریں۔ کیونکہ تاریخ ایک سلسلہ ہے اور انسانی تاریخ کے ذہنی سلسلہ میں جو جگہ جگہ خلا ہیں، انھیں پُر کرنا مورخ کا کام ہے۔ کیونکہ یہ تسلسل انسانی ذہن کو ترقی کی جانب رواں دواں رکھتا ہے۔ اس لئے کھوئی ہوئی چیزوں، اور نوادرات کی تلاش، ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑنا، انسان کی شدید خواہش ہے۔

قدیم آرٹ کی گمنامی میں شاید ایک خوبی یہ بھی ہو کہ مستقبل کا آرٹ آزادی کے ساتھ تخلیق ہو۔ اگر پندرھویں صدی میں یونانی سنگ تراشی کے تمام نوادرات اصل حالت میں دستیاب ہو جاتے تو شاید لیونارڈو، رافیل، ٹی ٹان، اور کوریگیو شاندار مجسمے اور تصاویر نہیں چھوڑتے۔ کیونکہ یونان کی قدیم تخلیقات انھیں حوصلہ نہیں دیتیں اور ان کے ساتھ موازنہ کرتے وقت ذہنی طور پر وہ پیچھے رہ جاتے۔ اسی طرح اگر اٹھارویں صدی میں یونان کی نغمیہ شاعری ظاہر ہو جاتی تو یہ جرمنی کی شاعری کو ماند کر دیتی۔ اس لئے قدیم آرٹ و شاعری کا ایک خاص لمحہ پر ظاہر نہ ہونا آرٹ و ادب کی ترقی کیلئے ضروری ہے۔

وینی لوسکی

نکولائی وینی لوسکی روس کا سیاستداں اور مورخ تھا۔ اس نے ۱۸۶۹ء میں روس اور یورپ کے تعلقات پر ایک کتاب لکھی۔ اس میں اس نے یہ جائزہ لیا کہ کن وجوہات کی بنا پر صدیوں سے روس اور یورپ کے تعلقات کشیدہ رہے۔ اس کشیدگی کی تہہ میں اسے روس اور یورپ کے تمدنوں میں اختلاف نظر آیا اور وہ اس نتیجہ پر پہونچا کہ یورپ کا تمدن بے جان، بے حس اور زوال پذیر ہے، جبکہ اس کے مقابلہ میں روس کا تمدن قوت و طاقت، نئی زندگی اور ولولہ سے آگے کی جانب بڑھ رہا ہے۔

نکولائی وینی لوسکی یورپ کے تمدن کو آفاقی نہیں سمجھتا اور نہ ہی یورپی تمدن کو متحرک، جاندار اور ترقی یافتہ تسلیم کرتا ہے۔ دوسرے تمدنوں کا دائرہ اثر بھی محدود ہے اور ان حدود سے باہر اس کا اثر و دخل

نہیں۔ روسی تمدن بذاتِ خود ایک جداگانہ تمدن ہے، جس کی اپنی علیحدہ خصوصیات اور عناصر ہیں۔ اس کی اپنی انفرادی حیثیت ہے۔ اس لئے روسی تمدن نے یورپی تمدن سے اور اس کے تجربات سے کسی قسم کا حصّہ نہیں لیا۔

ڈینی لوسکی نے تاریخ کے اس اہم سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ تمدن کی زندگی اور موت کا کیا راز ہے؟ اور وہ کون سی قوتیں اور عوامل ہیں جو تمدن کے عروج و زوال میں حصّہ لیتے ہیں؟ اور کیوں ہر تمدن زندگی کے مرحلوں سے گذرتا ہوا فنا کی وادیوں میں گم ہو جاتا ہے؟ ان سوالات کا جواب دیتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ دنیا کی تاریخ مختلف تمدنوں پر مشتمل ہے اور ہر تمدن نے اپنے دائرے اور حدود میں رہتے ہوئے انسانیت کی ترقی میں برابر کا حصّہ لیا ہے۔ اس لئے کوئی تمدن آفاقی ہونے کا دعویدار نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی تاریخ میں ۱۲ تمدن مشہور ہیں، جنھوں نے انسانیت کی تاریخ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور اپنے اپنے دائرے میں انقلابی تبدیلیاں لائے ہیں۔ یہ مشہور ۱۲ تمدن یہ ہیں:

مصری، چینی، اشوری و بابلی، قدیم سمیری، فونیقی، چالڈی، ہندو، ایرانی، یہودی، یونانی، عرب، اور یورپی۔

امریکہ میں دو تمدن پیدا ہوئے، ایک میکسیکو اور دوسرا پیرو میں۔ لیکن یہ دونوں تمدن شباب پر پہونچنے سے پہلے ختم ہو گئے۔

نکولائی ڈینی لوسکی تمام انسانی قبیلوں اور نسلوں کو تین حصّوں میں تقسیم کرتا ہے:

(۱) وہ جماعت جو تخلیقی افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ اپنی صلاحیت اور ذہانت سے تمدن کو ترقی پذیر بناتے ہیں۔

(۲) دوسری جماعت ان لوگوں پر تشکیل پاتی ہے جنھوں نے معاشرے میں منفی کردار ادا کیا اور دنیا میں تباہی و بربادی لائے جیسے منگول، ہن، اور ترک (ابتدائی زمانہ میں)

(۳) تیسری جماعت میں وہ لوگ آتے ہیں جنھوں نے نہ تو تمدن میں کوئی مقام حاصل کیا اور نہ تباہی و بربادی میں کوئی حصہ لیا۔ اس جماعت کے لوگوں نے تاریخ میں نہ تو منفی کردار ادا کیا اور نہ مثبت۔ لیکن یہ لوگ دوسرا مثبت و منفی طاقتوں کے ذریعے استعمال میں لائے گئے اور ان کی ہدایت و رہنمائی میں انھوں نے تاریخ میں کردار ادا کیا۔

اس سے وینی لوسکی نے یہ نتیجہ نکالا کہ انسانی تمدن کی تاریخ میں جہاں مثبت قوتیں ہیں وہاں منفی قوتیں بھی برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ منگول، ہن اور ترکوں نے تباہی و بربادی اور قتل و غارتگری کا بازار گرم کیا اور ایک مرتے ہوئے تمدن کو مرنے میں مدد دی، اور اس کے بعد پھر خانہ بدوشی کی زندگی اختیار کر لی جس کا کوئی مقصد نہیں تھا اور آخر اسی حالت میں روپوش ہو کر گمنامی میں ختم ہو گئے۔ جرمن اور عرب قبیلے جو اسی خانہ بدوشی کی حالت میں تھے ان سے بھی تعمیری اور تخریبی دونوں کام لئے گئے۔

تاریخ میں ایسے قبائل بھی ہیں جن کی تخلیقی صلاحیتیں ابتدائی درجہ میں رک گئیں، ایسی صورت میں نہ تو وہ تعمیری بن سکے اور نہ تخریبی، انھوں نے نہ تو مثبت کردار ادا کیا اور نہ منفی، ان لوگوں کی حیثیت "تشکیل سیرت کے مواد" کی ہوتی ہے جو معاشرہ اور تمدن کو سہارا۔

دیتے ہیں اور اس کی قوت و طاقت میں اضافہ کرتے ہیں ۔ یہ قبائل بذاتِ خود تمدن میں کوئی اضافہ نہیں کرتے لیکن اس کی ترقی میں مدد ضرور دیتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی اپنی نہ تو کوئی تاریخ ہوتی ہے اور نہ ہی یہ نمایاں حیثیت سے ابھرتے ہیں ۔ یہ پس منظر میں کچھ دیر باعمل رہ کر ختم ہو جاتے ہیں۔

کبھی کبھی بے جان اور زوال پذیر تمدن ان خانہ بدوش قبائل تک پہونچ جاتا ہے جو تہذیب و تمدن سے مبرّا ہوتے ہیں، لیکن جب تک کوئی تخلیقی نظریہ پرانے اور نئے تمدن کے افکار و خیالات کو متحد کر کے ان میں نئی زندگی اور جذبہ پیدا نہ کرے اس وقت تک وہ ابھر نہیں پاتے ۔ اس کی مثال ان لوگوں کی ہے جنھوں نے مغربی یورپی شہنشاہیت قائم کی ۔ یہ لوگ رومی تمدن کیلئے "تشکیلِ سیرت کا مواد" ثابت ہوئے اور شہنشاہیت کے خاتمہ کے بعد ایک نئی شکل میں دوبارہ ابھرے ۔ اس کی دوسری مثال منگولوں اور ترکوں کا قبولِ اسلام ہے جس کی وجہ سے اسلام کی گرتی ہوئی طاقت سنبھل گئی۔

ونیلوسکی کے نزدیک تمدن ایک وسیع اور جامع شے ہے جو ایک خاص علاقہ میں اپنا اثر رکھتی ہے ۔ مثلاً : یونانی تمدن کا جب ذکر ہوتا ہے تو اس سے مراد پورا یونان جس میں ایتھنز اور اسپارٹا شامل ہیں، آجاتے ہیں ۔ مغربی تمدن میں جرمنی، اٹلی، اور دوسرے یورپی ممالک آجاتے ہیں ۔ اس لحاظ سے تمدن ان تمام ملکوں کی تاریخ کو ایک دامن میں سمیٹ لیتا ہے ۔ جو ملک ان تمدنوں کے دائرے اور اثر میں نہیں آتے، ان کی تاریخ آزاد ہوتی ہے ۔

ویکو بھی تمدن کو انسانی زندگی سے تشبیہ دیتا ہے۔ یہ بھی اسی طرح مراحل سے گذرتا ہوا آخر میں مر جاتا ہے۔ اس لئے ہر تمدن کا انجام یقینی موت ہوتا ہے۔ لیکن تمدن کی زندگی میں اس کا دورِ شباب اور عروج دوسرے ادوار کے مقابلہ میں سب سے مختصر ہوتا ہے، کیونکہ اس دور میں تمدن زندگی کی تمام قوت و طاقت نچوڑ لیتا ہے اور اس کے بعد اس کا جسم طاقت سے محروم ناتواں و لاغر ہو جاتا ہے۔ ذہن و دماغ تخلیقی صلاحیتیں کھو دیتا ہے اور وہ گھسٹتے ہوئے موت کی جانب رواں دواں ہو جاتا ہے

ویکو تمدن کی زندگی کو تین دوروں میں تقسیم کرتا ہے:

(۱) جب تمدن کی حیثیت "تشکیل سیرت کے مواد" کی ہوتی ہے۔ یہ اس شکل میں ہزاروں برس قائم رہ سکتا ہے۔ لیکن جب یہ ایک خاص شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس وقت ایک منظم معاشرے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ منظم معاشرے کی تشکیل کے بعد اس کی پہلی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔

(۲) تمدن کی زندگی کا دوسرا دور درمیانی ہوتا ہے۔ اس دور میں ثقافت و سیاست کی ابتداء ہوتی ہے اور تخلیقی قوتیں جمع ہوتی ہیں تاکہ آنے والی زندگی میں کام آسکیں۔

(۳) تیسرا دور "دورِ شباب" ہوتا ہے۔ اس میں معاشرہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے ترقی کی انتہا تک پہونچتا ہے لیکن یہ دور سب سے مختصر ہوتا ہے، اس کی زندگی کی مدت چار سے چھ صدیاں ہوتی ہیں۔

تیسرے دور میں معاشرہ یا قوم کی تمام تخلیقی صلاحیتیں بروئے کار

آجاتی ہیں، لہٰذا اس کے بعد تمدن تخلیقی طور پر خستہ اور مضمحل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ خستگی زوال کو دعوت دیتی ہے جس کے بعد تمدن ٹکڑے ٹکڑے ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ تمدن کی زندگی اور موت کا یہ عمل عین فطرت کے مطابق ہے۔ جس طرح موسم گرما جب اپنی شدت پر پہنچتا ہے تو دن چھوٹے ہونا شروع ہو جاتے ہیں، اور سخت گرمی اس وقت شروع ہوتی ہے جب سورج اپنی بلندی سے گذر جاتا ہے۔ جس طرح انسانی زندگی میں، درمیانی عمر میں ذہن کی زرخیزی و جولانی ختم ہو جاتی ہے، اسی طرح تمدن کا زوال بھی اس کے عروج کے بعد سے شروع ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہر تمدن زندگی کی بھرپور رعنائیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور آخر میں تھکا ماندہ، خستہ، مضمحل اور بے جان ہو کر دم توڑ دیتا ہے۔

اسپینگلر

اوسوالڈ اسپینگلر ۱۸۸۰ء میں بلانخن برگ کے مقام پر پیدا ہوا، اعلیٰ تعلیم جرمنی کی تین مشہور یونیورسٹیوں، میونک، برلن، اور ہال میں حاصل کی۔ اس کے بعد اسکول میں درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۹۱۱ء میں اس کے ذہن میں "زوالِ مغرب" لکھنے کا خیال آیا۔ اس لئے اس نے ملازمت چھوڑ کر اس کتاب کی تصنیف کی۔ ۱۹۱۲ء میں اس نے یہ مشہور کتاب مکمل کی۔ اسپینگلر کی کتاب نے تاریخ کے نظریہ میں ایک انقلابی تبدیلی کی اور فلسفۂ تاریخ میں گراں بہا اضافہ کیا۔

ماضی کے وسیع و عریض اور گنجلک پس منظر میں جب ایک فلسفی مورخ تمدن کے عروج و زوال کی ایک متحرک تصویر دیکھتا ہے تو اس کے ذہن میں بار بار یہ سوال ابھرتا ہے کہ: آخر زندگی اور موت کا یہ لامتناہی سلسلہ، تمدن کے عروج و زوال کا یہ المیہ کن قوانین کے تحت ہے؟ وہ کون سا نظام ہے جو اس عروج و زوال کے پیچھے سرگرمِ عمل ہے؟ کیا اس عمل

میں کوئی طاقت پوشیدہ ہے؟ اور کیا انسان کو اس پر کوئی اختیار ہے؟
اسپینگلر نے ان سوالات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے دنیا کے وسیع و عریض اسٹیج پر کھیلے جانے والے ڈرامے کو دیکھا، اور ان پراسرار قوتوں اور محرکات کی کھوج لگانے کی کوشش کی جو پردے کے پیچھے سے اس ڈرامہ کی ہدایت کاری میں مصروف ہیں۔ اس نے اس سوال کا جواب بھی ڈھونڈنے کی کوشش کی کہ: آخر کیا وجہ ہے کہ انسان باوجود محنت، کوشش، اور عمل پیہم کے ناکام ہے۔ اس کی تعمیر کردہ اور بنائی ہوئی نشانیاں کیوں ویرانی میں خاموشی کا لبادہ اوڑھے افسردگی کے ساتھ کھڑی ہیں؟

یہ عروج و زوال، یہ زندگی و موت، یہ شگفتگی و تازگی، اور اس کے بعد زردی و خزاں، اداسی و مجبوری، آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟ دنیا کے ہر حصے اور ہر دور میں کھیلا جانیوالا یہ ڈرامہ آخر کیا ہے؟ کیا انسان قدرت کی پراسرار طاقتوں کے ہاتھوں مجبور و بے بس ہے؟ کیا وہ شطرنج کے بے جان مہرے کی طرح ہے؟ کیا وہ جس راستے پر چل رہا ہے وہ اس کیلئے پہلے سے متعین کیا جا چکا ہے؟ یہ جو کچھ ہو رہا ہے کیا اس کا فیصلہ پہلے سے مرتب ہو چکا ہے؟ کیا انسان کی اپنی کوئی خواہش و مرضی نہیں؟ کیا وہ تقدیر کے اٹل قوانین کو تبدیل نہیں کر سکتا ہے؟ کیا وہ تقدیر کا مالک نہیں؟ بلکہ تقدیر کی بھاری زنجیروں میں بندھا و جکڑا ہوا، حرکت و آزادی سے محروم، مستقل ایک نپے تلے راستہ پر چلا جا رہا ہے۔ کیا تقدیر اور تاریخ لازم و ملزوم ہیں؟ کیا تاریخ بھی تقدیر کے بندھنوں میں بندھی، ماضی کے انبار کو اٹھائے ایک ہی راستے پر رواں دواں ہے؟
اسپینگلر ان سوالات کا جواب اثبات میں دیتا ہے۔ وہ تقدیر اور

تاریخ کو ایک مضبوط رشتہ میں جکڑا ہوا دیکھتا ہے۔ ایک ایسا مضبوط اور آہنی رشتہ جسے توڑنا انسان کی قوت و طاقت سے باہر ہے۔ تقدیر قوموں اور تمدنوں کو ایک متعین اور طے شدہ راستہ پر لیکر چلتی ہے: پیدائش، ارتقاء، شباب، ضعیفی اور موت۔ اس دائرے اور چکر سے فرار ممکن نہیں۔ تمدن کی زندگی اور موت اسی چکر میں گھومتی ہے۔ ہر تمدن کی پیدائش کے بعد موت ایک لازمی امر ہے یہ فطرت کا اٹل قانون ہے۔ جس میں کوئی ترمیم اور تنسیخ نہیں۔ جب ایک تمدن فنا کی وادی میں روپوش ہو جاتا ہے تو پھر اس کا احیاء اور دوبارہ زندگی ممکن نہیں۔ ہر مرنیوالا تمدن اپنے ساتھ اپنی تمام اقدار کو لے کر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے مردہ جسم میں نئی روح پھونکنا، اسے موت کی گہرائیوں سے واپس لانا اور اس کے بے جان ڈھانچہ کو آراستہ و پیراستہ کرنا ایک سعی لاحاصل ہوتی ہے۔

اسپینگلر تاریخ میں ہونیوالے واقعات جو قوموں کی زندگی میں انقلاب لاتے ہیں۔ یا کسی تحریک کی ابتداء، فن و آرٹ میں کمال، ان سب کو عقل سے بالاتر سمجھتا ہے۔ انسانی عقل مجبور ہے کہ وہ ان کی تہہ میں کام کرنیوالے عوامل سے باخبر ہو۔ کوئی انسانی ذہن اس سے پردہ نہیں اٹھا سکتا کہ آخر چینی تہذیب دو ہزار قبل مسیح میں کیوں پیدا ہوئی؟ مصر میں اہراموں کی تعمیر کیوں اور کس طرح ہوئی؟ اور گوتھک طرز تعمیر کس طرح سے تکمیل پذیر ہوا؟ اور نہ ہی انسانی ذہن اس کا کوئی جواب دے سکتا ہے کہ آخر ہر تہذیب موت سے ہمکنار کیوں ہوتی ہے؟ اس کے نزدیک تاریخ کے اس عمل میں پراسرار طاقتیں

کام کر رہی ہیں جن کا ادراک انسان کی فہم سے بالاتر ہے۔

اسپنگلر کے نقطہ نظر سے ہر تہذیب کی اپنی علیحدہ روح ہوتی ہے اور اس کی علیحدہ شکل و صورت ہوتی ہے۔ سیاسیات، اقتصادیات، فلسفہ، آرٹ اور مذہب وہ ذرائع ہیں جن سے ہر تہذیب اپنی ہیئت و صورت کو تشکیل دیتی ہے۔ کیونکہ ہر تہذیب انفرادی خصوصیت کی حامل ہے اس لئے ایک تہذیب دوسری تہذیب پر اثر انداز نہیں ہوتی ہر تہذیب اپنے ماحول، حالات، خصوصیات، اور اقدار کے دائرے میں محدود رہتی ہے۔ اس کی اپنی علیحدہ روح ہوتی ہے۔ اس کا اپنا جداگانہ اور خانہ ہوتا ہے، وہ اس میں مقید اور گرفتار رہتی ہے۔ ہر تہذیب کے ارد گرد بلند و بالا دیواریں ہیں اور ان سے نکل کر وہ دوسرے سے کوئی رشتہ اور تعلق قائم نہیں کر سکتی۔

اسپنگلر اس روایتی نظریہ کا مخالف ہے کہ "تاریخ ایک سلسلہ ہے" اور ایک تہذیب اپنا ورثہ دوسری تہذیب میں منتقل کر دیتی ہے اس طرح انسانی تہذیب کے خزانے میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ نظریہ سطحیت پر مبنی ہے کیونکہ ایک تہذیب کا دوسری تہذیب پر اثر بڑا سطحی و ظاہری ہوتا ہے کیونکہ کوئی تہذیب اپنی روح کو دوسری تہذیب کے قالب میں منتقل نہیں کر سکتی ہے۔ اس کی روح بھی اس کے ساتھ ہی مر جاتی ہے۔ یورپ میں تحریک نشاۃ ثانیہ کو یونانی و رومی تہذیبوں کا احیاء سمجھا جاتا ہے جو غلط ہے۔ مغربی تہذیب نے اس کے ظاہری اور معمولی اثرات کو قبول کیا ہے، لیکن اس کی روح کو وہ اپنے جسم میں حلول نہیں کر سکی۔ مغربی تہذیب

کی اپنی علیحدہ روح ہے، اسی لئے مغربی تہذیب میں نہ تو ڈورک طرز کے ستون نظر آتے ہیں اور نہ ایونک طرز کے ستون اور نہ ہی مصوری، موسیقی اور ڈرامہ میں یونان و روم کی روح نظر آتی ہے۔

چونکہ ہر تہذیب جداگانہ ماحول میں پیدا ہوتی ہے اور اس کا ارتقاء و ترقی بھی جداگانہ ماحول میں ہوتی ہے اس لئے ہر تہذیب اپنی علیحدہ خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔ مثلاً: یونانی و رومی تہذیبوں میں علم ہندسہ، اور شماریات، عربی تہذیب میں الجبرا، علم نجوم اور کیمیا اور مغربی تہذیب میں علم الاحصاء (Calculus) اور گلیلیو کا قوت محرکہ کا نظریہ۔ یا یونانی تہذیب میں برہنہ مجسمے، عربی تہذیب میں نقش و نگار اور بیل بوٹے اور مغربی تہذیب میں ریمبراں کی تصویروں میں دھوپ و چھاؤں کا تصور اور باخ کی موسیقی۔

اسپینگلر نے تہذیبوں کی زندگی اور موت (Morphology of Culture) کا جو نظریہ پیش کیا ہے۔ اس میں وہ اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ ہر تہذیب پیدائش، ارتقاء اور شباب کے بعد زوال پذیر ہوتی ہے ہر تہذیب کا انجام ایک سا ہوتا ہے۔ ہر تہذیب تقریباً ایک ہزار سال کی مدت میں ان مقررہ درجوں سے گذرتی ہوئی فنا ہو جاتی ہے۔ یہ تہذیبوں کے عمل اور اختیار سے باہر ہے کہ وہ فنا سے بچ سکیں۔ تقدیر کی زنجیریں اس قدر وزنی اور مضبوط ہیں کہ ان کو توڑنا اور آزاد ہونا، ممکن نہیں۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ اسپینگلر کے ہاں جب

تمدن کا لفظ آتا ہے تو اس کی مراد تہذیب کا آخری دور ہوتا ہے۔
اس نے تہذیبوں کے مطالعہ کے بعد ان کی پیدائش، ارتقاء، شباب، اور موت کے مندرجہ ذیل درجہ متعین کئے ہیں

(۱) تہذیب کا ابتدائی زمانہ:

یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جس میں تہذیب کوئی خاص شکل اختیار نہیں کرتی اس زمانہ میں معاشرے کے افراد سیدھی سادی زندگی گذارتے ہیں۔ محبت کرتے ہیں، کام کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ اس زمانہ میں معاشرہ منظم نہیں ہوتا اور نہ ہی اس دور میں مذہب، آرٹ اور سائنس کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس لئے معاشرے کا یہ دور "تاریخی گمنامی" کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ معاشرہ تہذیب کی پیدائش کیلئے مواد فراہم کرتا ہے۔ مغربی تہذیب میں یہ ابتدائی زمانہ میروونجین (Merovingiam) اور کارولنجین (Carolingian) کا زمانہ ہے۔ جس کی مدت ۹۰۰ سے لے کر ۵۰۰ ق م تک ہے۔

تہذیب اس وقت پیدا ہوتی ہے جب معاشرے میں آرٹ، سائنس اور مذہب کی تشکیل سادہ انداز میں ہوتی ہے۔ یونان میں اس دور میں ڈورک طرز کے مندر بنے اور مغربی تہذیب میں گوتھک طرزِ تعمیر اختیار کیا گیا۔ اسی زمانہ میں دیومالائی اور مذہبی عقائد پیدا ہوتے ہیں جیسے ہندوستان میں وید، یونان میں ہومر کے دیوتا اور مغربی تہذیب میں قرونِ وسطیٰ کے جرمن اساطیر۔ اس لحاظ سے مغربی تہذیب کی پیدائش کا زمانہ ۹۰۰ء قرار دیا جا سکتا ہے۔

(۲) موسمِ بہار:

تہذیب کے اس دور کو اسپینگلر موسمِ بہار سے تشبیہ دیتا ہے۔ اس دور کی اہم خصوصیات یہ ہیں: اس دور میں جاگیرداری نظام ایک سیاسی طاقت اور نظام بن کر ابھرتا ہے۔ زمین پیداوار کا سب سے بڑا ذریعہ بن جاتی ہے، اسی لئے زمین کے ذریعہ قوت و طاقت حاصل کی جاتی ہے، جو زمین پر قابض ہوتے ہیں وہ ذرائع پیداوار کے مالک ہوتے ہیں، اور اس حیثیت سے وہ حکمراں کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ روحانی اعتبار سے یہ زمانہ بہادری، مذہبی عقائد کی پختگی، اور تصوریت (Idealism) کا ہوتا ہے۔ اس دور کی معیشت زراعت پر ہوتی ہے۔ اس دور کے خاتمہ کی ابتداء جب ہوتی ہے جب کسان اور جاگیردار کا تصادم شروع ہو جاتا ہے۔ اس تصادم سے یہ نظام ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد سے امراء کا اقتدار بڑھتا ہے، شہروں کی آبادی میں اضافہ ہوتا ہے، اس مرحلہ پر اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ مغربی تہذیب میں یہ زمانہ سنہ ۹۰۰ء سے سنہ ۱۵۰۰ء تک کا ہے۔

(۳) موسمِ گرما:

اس کے بعد تہذیب موسمِ گرما کے دور میں داخل ہوتی ہے۔ یہ دور خاص طور سے شہروں کی تعمیر اور ان کی ترقی کی وجہ سے اہم ہوتا ہے۔ یونانی تہذیب میں یہ دور شہری ریاستوں کے عروج کا تھا۔ اس کا خاتمہ پریکلیس کے سنہری دور پر ہوا۔ رومی تہذیب میں، اس دور میں اٹرسکن بادشاہوں کی جگہ رومی امراء نے لے لی اور بالآخر امراء اور عوام کے تصادم کے بعد اس کا خاتمہ ہوا۔ مغربی تہذیب میں یہ زمانہ بے ڈھنگے طرز

تجمل و آرائش کا ہے (Baroque) جو فرانسیسی انقلاب پر ختم ہوتا ہے۔

اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت شہروں کی آبادی اور ان کی ترقی ہے۔ اس لئے اسپینگلر دنیا کی تاریخ کو شہروں کی تاریخ کہتا ہے۔ اس کے نزدیک دنیا کی تمام بڑی تہذیبیں شہروں کی تہذیبیں ہیں۔ اس دور کا ہر آدمی شہر کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوتا ہے۔ یہاں آکر "دنیا کی تاریخ" اور "انسانی تاریخ" میں بڑا فرق نظر آتا ہے۔ کیونکہ دنیا کی تاریخ شہر کے آدمی کی تاریخ ہے۔ سیاست، مذہب، فن، آرٹ، سائنس، یہ تمام علوم شہر کی فضا میں پروان چڑھتے ہیں۔ لیکن اس عمل میں سب سے بڑا معجزہ ایک شہر کی روح کی پیدائش ہے۔ ایک شہر اور گاؤں میں جو چیز تفریق کرتی ہے وہ چھوٹائی اور بڑائی نہیں بلکہ روح کی موجودگی ہے۔ شہر قائم ہونے کے بعد بورژوا طبقہ سیاسی و معاشی اور روحانی طور پر آہستہ آہستہ جاگیرداروں اور مذہبی پیشواؤں کو بے دخل کر دیتا ہے۔ معاشی طور پر شہری معیشت میں پیسہ طاقت بن جاتا ہے، زمین کی قدر و قیمت ختم ہو جاتی ہے۔ شہر گاؤں پر فتحیاب ہو جاتا ہے اور پیسہ زمین پر فوقیت حاصل کر لیتا ہے ہر تہذیب اپنے گوتھک گرجا میں اپنے مذہبی عقائد کو بناتی و سنوارتی ہے۔

اسی زمانہ میں فلسفیانہ خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ دور فن اور سائنس کے عروج کا دور ہوتا ہے۔ اسی زمانہ میں ذہین اور باصلاحیت افراد پیدا ہوتے ہیں جیسے ہندوستان میں برہمن، یونان میں سوفسطائی اور یورپ میں "سنوانارولا" لوتھر اور کالون۔ فلسفہ میں اس کی مثال ہندوستان میں اپنشد، یونان میں

سقراط سے پہلے کا زمانہ اور یورپ میں بیکن، ڈیکارٹ اور گلیلیو۔ اس دور میں فن، مذہب، فلسفہ اور سائنس ذہن و شعور کی بلندیوں پر پہونچ جاتی ہے جو کھیت میں کام کرنیوالے کسان کی فہم سے بالاتر ہوتی ہے

(۴) ہر تہذیب کی اپنی خزاں ہوتی ہے۔ اس دور میں تہذیب عقاید سے نکل کر عقل کے دائرے میں آتی ہے۔ اسی زمانہ میں فلسفہ کا نظام مکمل ہوتا ہے جیسے ہندوستان میں یوگا اور ویدانت، یونان میں افلاطون اور ارسطو، اسلام میں ابن رشد اور ابن سینا، اور مغرب میں کانٹ اور ہیگل۔

(۵) تہذیب جب اپنے موسم سرما میں داخل ہوتی ہے تو اس وقت اس میں مادی نظریات فروغ پاتے ہیں۔ اس دور میں ہر چیز کو مادیت کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے جیسے یونان میں رواقی و ایپی کیورین فلسفی، فلسفۂ کلبیہ کے پیرو اور مغرب میں بینتھم، کامٹے اور کارل مارکس۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ ہر تہذیب دیومالائی تصورات سے باقاعدہ مذہبی عقاید تک پہلے درجہ میں، ابتدائی فلسفہ سے رواداری، آزاد خیالی اور مکمل فلسفیانہ نظام تک دوسرے درجہ میں، مکمل فلسفیانہ نظام سے مادیت و سائنس تک تیسرے درجہ میں سے ہو کر گزرتی ہے۔ اس کے بعد تہذیب اپنی زندگی کے آخری دور میں جو زوال، فنا اور موت کا ہے، داخل ہوتی ہے۔ یہ آخری دور دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ پہلا:

لڑائی اور اختلافی زمانہ" کا ہوتا ہے۔ یہ زمانہ دو صدیوں تک چلتا ہے۔ اس کا خاتمہ اس وقت ہوتا ہے جب ایک طاقت فتح یاب ہو جاتی ہے اور فتح کے بعد اپنا اقتدار اس علاقہ میں قایم کر لیتی ہے جو تہذیب کی عملداری میں ہوتا ہے۔ اس وقت "شہنشاہی ریاست" پیدا ہوتی ہے۔ اس کے پیدا ہوتے ہی تہذیب زندگی کی آخری منزل میں قدم رکھتی ہے۔ اس دور میں تمام مہذب دنیا بالواسطہ یا بلاواسطہ، قانونی یا غیر قانونی طور پر ایک شخصیت کے قبضہ میں ہوتی ہے، چاہے اس کا خطاب سیزر ہو یا شہنشاہ۔ وہ علاقے جو شہنشاہیت کے دائرے میں ہوتے ہیں وہاں امن و امان ہوتا ہے۔ چونکہ شہنشاہ کی شخصیت طاقتور اور تمام اختیار کی مالک ہوتی ہے اس لئے اسے حاصل کرنیکی مسلسل کوششیں کی جاتی ہیں جس کا نتیجہ نجی جنگوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ زمانہ قومی جنگوں کا نہیں بلکہ نجی جنگوں کا ہوتا ہے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے طاقتور افراد، فوجی راہنما، اور آمر اپنا اقتدار قایم کرتے ہیں۔ ان کی طاقت اس وقت مضبوط ہو جاتی ہے جب "عالمی امن" کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت قوموں میں طاقت و قوت کی خواہش ختم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ افراد کی ذاتی خواہشات لے لیتی ہیں۔ عالمی امن کے زیر سایہ ایک طاقتور فرد اپنے فوجی ساتھیوں کی مدد سے لوگوں پر حکومت کرتا ہے۔

تہذیب کے آخری دور میں "عالمی شہر" وجود میں آتے ہیں۔ جو انسانیت سوز، تباہ کن، اور تمدن کے المیہ کی نشانی بن جاتے ہیں۔ یہ شہر وہ مرکز ہوتا ہے جہاں دنیا کی تاریخ اپنی تمام قوتیں جمع کر کے ختم ہو جاتی ہے۔ ہر تمدن میں یہ عالمی شہر اور عظیم مرکز پورے ملک کی تہذیب کو نچوڑ لیتا ہے۔

یہاں کوئی امیر و بورژوا، آزاد و غلام، مہذب و غیر مہذب اور مومن و مشرک نہیں ہوتا، بلکہ تمام شہری "ہر دیسی" (Cosmopolitan) ہوتے ہیں۔ ان میں اور صوبائی باشندوں میں فرق اور بُعد بڑھ جاتا ہے اور یہ فخر سے خود کو ہر دیسی اور انھیں حقارت سے صوبائی کے نام سے پکارتے ہیں۔

اسپنگلر نشاندہی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب تک "چولہا" سیدھی سادھی زندگی اور خاندان کا مرکز رہتا ہے اور انسانی ذہن اس سے متعلق رہتا ہے اس وقت تک زندگی میں سکون و اطمینان اور قرار ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ طریقہ زندگی تبدیل ہوتا ہے تو کسان اور کاشتکار جو آرام کی زندگی گذارتے تھے شہروں میں مکانوں کے وسیع سمندر میں آوارہ و سرگرداں پناہ کی تلاش میں پھرتے ہیں جیسے تہذیب کے ابتدائی دور میں شکاری خوراک کی تلاش میں پھرتے تھے۔ یہ آوارہ گرد افراد "ذی ہوش خانہ بدوش" کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اسپنگلر لکھتا ہے کہ:

بڑے شہروں نے قصبوں اور گاؤں کے بہترین خون کو چوس لیا ہے۔ اس کے باوجود اس کی پیاس برابر بڑھ رہی ہے اور یہ برابر تازہ، شگفتہ اور سادہ انسانوں کے سمندر کو ہڑپ کر رہے ہیں۔ تاریخ کے اس آخری شاندار دور میں جب شہر کی خوبصورت اور گناہ آلود زندگی اپنے شکار کو پکڑ لیتی ہے تو پھر اسے آزاد نہیں ہونے دیتی۔ قدیم زمانے میں لوگ اپنے آپ کو زمین سے آزاد کر لیتے تھے اور آزادانہ گھومتے تھے، لیکن یہ ذی ہوش خانہ بدوش شہر کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں ان کے دل میں اس مجبوری کے باوجود شہر کی محبت شدید

سے شدید تر ہوتی چلی جاتی ہے اور پھر ہر بڑا شہر اپنی خصوصیت کے لحاظ سے اس کا گھر بن جاتا ہے لیکن قریبی گاؤں کی زندگی اس کے لئے اجنبی ہو جاتی ہے۔ وہ شہر کے فٹ پاتھ پر دم توڑ دیتا ہے لیکن اپنی زمین پر واپس نہیں جاتا۔

عالمی شہروں کی ترقی کے ساتھ ساتھ آبادی میں کمی واقع ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہ عمل صدیوں جاری رہنے کے بعد مکمل ہوتا ہے۔ یہ تمدن کے سفر کی آخری آرامگاہ ہوتی ہے کیونکہ آدمی بحیثیت نسل انسان کے زندہ رہنا نہیں چاہتا، اس کے لیئے زندگی ایک سوال بن جاتی ہے، جب پڑھے لکھے اور مہذب لوگوں میں یہ بحث ہو کہ بچوں کے ہونے سے کیا نقصان اور فوائد ہیں؟ تو اس وقت تاریخ ایک انقلاب صدمے سے دوچار ہوتی ہے۔ جب زندگی کے متعلق دلائل دئے جائیں تو اس وقت زندگی بذات خود سوال بن جاتی ہے۔ اس مرحلہ پر احتیاطاً پیدائش کی رفتار رک سی جاتی ہے۔ یونانی تہذیب پر جب یہ وقت آیا تو پولی بیس (Polybius) نے اس پر اظہار افسوس کیا اور اسے یونان کی تباہی قرار دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عالمی شہر آہستہ آہستہ گھٹنا شروع ہو جاتے ہیں اور آخر میں چند لوگوں کی آبادی ان کھنڈرات میں قدیم طرزِ زندگی گذارنے لگتی ہے۔ جب ہیون سانگ نے اشوک کا پاٹلی پتر دیکھا تو وہ غیر آباد اور اجاڑ مکانوں پر مشتمل تھا۔ پولی بیس نے جب یونان کے مشہور شہروں کی تاریخ لکھی تو اس وقت ان کی پر رونق گلیاں غیر آباد ہو چکی تھیں۔ محلات کی دیواریں گر رہی تھیں۔ مشہور امفی تھیٹر میں گھاس اگی ہوئی تھی جہاں مویشی چرتے پھرتے تھے۔ مجسموں پر کائی کی تہیں جمی ہوئی تھیں اور جگہ جگہ خودرو جھاڑیاں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔

شہروں کی آبادی کے ساتھ ساتھ پیسہ کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ ابتداء میں پیسہ کا کام صرف یہ تھا کہ چیزوں کی قیمت کا تعین کرے زمین، جانور، مکانات اور غلام حقیقی قیمت تھے، لیکن شہروں کے وجود میں آنے کے بعد اور معاشی نظام میں تبدیلی کے بعد پیسہ بذاتِ خود قیمت بن جاتا ہے، اس کی قدر و قیمت ان چیزوں سے بڑھ جاتی ہے جن کی قیمت مقرر کرنے کیلئے اسے ایجاد کیا گیا تھا۔

تمدن کے آخری دور میں تخلیقی روح ختم ہو جاتی ہے۔ فن، مذہب اور سیاست میں کوئی تخلیق نہیں ہوتی۔ زندگی صرف مادی اور تجارتی مقاصد کیلئے وقف ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی کچھ مغربی تہذیب میں ہو رہا ہے۔ اسپنگلر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہتا ہے کہ :

"اب ہم جب نمائشوں میں، موسیقی کے میلوں میں، اور تھیٹروں میں جاتے ہیں تو وہاں مسخروں، ڈھول بجانے والوں اور بیوقوفوں کو اچھل کود کرتے پاتے ہیں۔ ان کا یہ فن مارکیٹ کی خاطر ہوتا ہے وہ صرف ایسی چیز پیش کرتے ہیں جو عوام کو خوش کرے۔ آرٹ، موسیقی اور ڈرامہ کی اقدار دم توڑ چکی ہیں"

تمدن کے آخری دور میں دوبارہ مذہبی جنون پیدا ہوتا ہے، لیکن اس کی شکل موسم بہار کے مذہب سے جدا ہوتی ہے۔ موسم بہار میں مذہب اپنی پوری قوت و طاقت سے ابھرتا ہے، لیکن آگے چلکر جب وہ اپنی اصلی ہیئت کو برقرار نہیں رکھ سکتا تو اس وقت مذہبی اصلاح کی تحریک شروع ہوتی ہے اور خالص مذہبیت کا زمانہ آتا ہے، جو "مذہبی جنون" پیدا کرتا ہے۔ یہ مذہب کو اور مذہبی تقدس کو طاقت کے ذریعے نافذ کرتے ہیں۔ "پیورٹن ازم" کے بعد

عقلیت کا زمانہ آتا ہے، اور عقلیت کے بعد مادیت پروان چڑھتی ہے۔
تہذیب مذہب کی تخلیقی قوتوں سے پیدا ہوتی ہے، اور اس کی پرورش
دیہات کی فضا میں ہوتی ہے۔ شہروں میں آرٹ و فن میں پختگی آتی
ہے، آخر کار تہذیب عالمی شہر میں مادیت کی آغوش میں دم توڑ
دیتی ہے۔

عقلیت و ذہنی شعور کے خلاف غیر عقلی و غیر فطری اور مجہولانہ
فرقے پیدا ہونا شروع ہو جاتے ہیں جیسے اسکندریہ میں سیراپس
(Serapis) کا فرقہ روم میں آئی سس (Isis) کا
فرقہ، اور مغربی تہذیب میں "ازم" اسی کی ایک شکل ہے۔ یہ اس
بات کی جانب اشارہ ہے کہ دوسرا مذہبی دور شروع ہونیوالا ہے۔
اس کی ابتداء اعلیٰ طبقہ سے نہیں ادنیٰ طبقہ سے ہوگی۔ مغربی تہذیب
اس وقت اس عمل سے دوچار ہے۔ جب یہ عمل پورا ہو جائے گا تو یورپ
میں گوتھک عیسائیت دوبارہ واپس آ جائے گی۔

اسپنگلر اس درجہ پر تہذیب کو موت سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ اس کے
نزدیک تمدن فنا ہو کر روپوش ہو جاتا ہے، لیکن معاشرہ اس وقت
بھی برقرار رہتا ہے۔ آدمی کی مثال ایک درخت کی ہو جاتی ہے جو زمین
میں مضبوط قدم جمائے زندگی کو برقرار رکھتا ہے، لیکن اس میں اعلیٰ
جذبہ اور جوش ختم ہو جاتا ہے۔ گاؤں دوبارہ سے پیدا ہوتے ہیں،
کسان پھر اپنے کام میں معروف ہوتا ہے۔ قدیم عالمی شہروں کی ویران
زمین میں بیج ڈالے جاتے ہیں اور اس خاکستر سے پیدا ہونیوالا
معاشرہ "تاریخی گمنامی" میں اپنے آپکو چھپا لیتا ہے۔ اس دور
میں آدمی شکل سے گذر اوقات کرتا ہے۔ زندگی کی اس اذیت

اور کرب میں وہ دوبارہ مذہبی زندگی اختیار کرلیتا ہے، جو اسے مصیبتوں، تکلیفوں، اور اذیتوں کو برداشت کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ یہ ایک بے مقصد ڈرامہ ہے۔ بے مقصد ستاروں کی رفتار، زمین کی گردش، سمندروں کا اتار چڑھاؤ، اور جنگلوں کا پھیلاؤ، ایک مہمل ڈرامہ، جو اس دنیا میں کھیلا جارہا ہے۔ چاہیں تو ہم اس کی توصیف کریں یا اس پر نوحہ کناں ہوں۔ لیکن یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔

اسپنگلر نے مغربی تہذیب کے ارتقاء کے جو درجے متعین کئے ہیں وہ یہ ہیں: مغربی تہذیب کی ابتداء صلیبی جنگوں سے ہوئی، اس کا موسم بہار ازمنہ وسطیٰ میں ختم ہو گیا، جبکہ نظام جاگیرداری قائم تھا، نائٹوں کی بہادری اور شجاعت کی روایات تھیں، اور تصوف و فلسفہ کی ابتداء ہوئی تھی۔ اس کا موسم گرما تحریک نشاۃ ثانیہ سے شروع ہوا، جس میں قومی ریاستیں قائم ہوئیں، شہروں کی آبادی بڑھی، سرمایہ داری نظام نے جڑیں پکڑیں، ریاضی، فلسفہ، اور اطالوی مصوروں نے ترقی کی۔ اس کی خزاں اٹھارویں صدی سے شروع ہوتی ہے جب موزارٹ، گوئٹے اور کانٹ نے اس تہذیب کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے کمال تک پہنچایا۔ انیسویں صدی اس کے زوال کی ابتداء ہے جس میں مادیت پرستی کے نقیب کامٹے، ڈارون، اور کارل مارکس پیدا ہوئے۔ انارکسٹ و سوشلسٹ تحریکیں ابھریں۔ منطق دانوں، ثبوتیت پسندوں اور ماہر نفسیات کی مقبولیت بڑھی۔ فن تعمیر، آرٹ اور فن میں سطحیت نمایاں ہونا شروع ہوئی۔ اسپنگلر

اس آخری لمحہ میں مغربی تمدن سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

"ہمیں تقدیر نے اس تمدن میں پیدا کر دیا ہے۔ اس وقت جب کہ یہ آخری اور فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہو رہا ہے، اس وقت جب کہ دولت اپنی فتح کے آخری جشن منا رہی ہے۔ اس وقت جب کہ سیزرازم خاموش اور مضبوط قدموں سے کامیابی کی جانب بڑھ رہا ہے۔ زندگی کا دائرہ تنگ سے تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا حسن و نکھار ڈھل رہا ہے۔ ہم اپنی آزادی اور خود مختاری کھو رہے ہیں — تاریخ جو فیصلہ دے چکی ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔"

تہذیبوں کے مطالعہ سے اسپنگلر اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ ہر تہذیب جدا اور منفرد ہوتی ہے۔ اس کی علیحدہ روح اور ہیئت ہوتی ہے۔ اس لئے کوئی ایسی تہذیب نہیں جو آفاقی ہو اور ابدی اقدار پر مبنی ہو۔

اسپنگلر کے نزدیک ہر ترقی یافتہ زمانے میں معاشرہ غیر جمہوری رہا ہے ہر تہذیب کے زیر سایہ پروان چڑھنے والے معاشرے میں چاہے جمہوریت، آمریت، بادشاہت، یا پارلیمانی نظام ہو، اس کے پردے میں اقلیت حکومت کرتی ہے۔ اس لئے معاشرہ ہمیشہ حاکم و محکوم میں بٹا رہتا ہے۔ جمہوریت ہر تہذیب کی زندگی کا ایک گذرتا ہوا لمحہ ہے۔ اس میں بورژوا طبقہ اپنی دولت اور ذہانت سے اقتدار حاصل کر کے، بے حس اور خاموش عوام پر حکومت کرتا ہے۔

اسپنگلر تاریخ میں باعمل شخصیتوں کو مفکرین پر ترجیح دیتا ہے۔ سکندر، سیزر اور نپولین نے تاریخ میں جو انقلابی تبدیلیاں کیں اور اپنی قوت و طاقت سے جو سیاسی، سماجی اور معاشی تبدیلیاں لائے، اس کے مقابلہ میں ارسطو یا افلاطون کچھ نہیں۔

اسپنگلر سیاست کو اخلاق سے بالاتر سمجھتا ہے۔ سیاست حق و باطل کے تصور سے آزاد ہے۔ سیاستداں جن عقائد کو اپنی نجی زندگی میں عزیز رکھتا ہے، عملی دنیا میں وہ ان پر کاربند نہیں ہوتا۔

دنیا کی تاریخ کی مثال ایک عالمی عدالت کی سی ہے۔ اس کا فیصلہ ہے کہ ایک اچھی اور خوشگوار زندگی ہمیشہ طاقتور کو میسر آتی ہے۔ یہاں حق و انصاف طاقت پر قربان کر دئے جاتے ہیں۔ موت ان کے حق میں اپنا فیصلہ دیتی ہے جو حق کو عمل سے زیادہ اور انصاف کو طاقت سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔

لہٰذا اسپنگلر تاریخ اقوام عالم میں کسی آفاقی، ابدی اور کلی اقدار کا قایل نہیں۔

کولنگ وڈ

رابن جارج کولنگ وڈ ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوا۔ زندگی کا بیشتر حصہ آکسفورڈ میں گذرا جہاں وہ فلسفہ کی درس و تدریس میں مصروف رہا۔ کولنگ وڈ کی مشہور کتاب "تاریخ کا تصور" (Idea of History) اس کی وفات کے بعد ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد کولنگ وڈ، بحیثیت فلسفی کے، جس نے تاریخ کے نظریات پر جدید انداز سے نظر ڈالی ہے، بہت مشہور ہوا۔

تاریخی واقعات کو تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھنا، ان کے اسباب و علل اور پس منظر کو بیان کرتے ہوئے ان کی تاویل پیش کرنا "فلسفۂ تاریخ" کہلاتا ہے۔ فلسفۂ تاریخ کی اصطلاح سب سے پہلے والٹیر نے استعمال کی تھی۔ اس سے اس کی مراد یہ تھی کہ آزاد ذہن اور کھلے دماغ

کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے، اور پھر واقعات کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ اس کے بعد ہیگل نے اس اصطلاح کو دوسرے وسیع معنوں میں استعمال کیا۔ اس کے نزدیک فلسفۂ تاریخ سے مراد تمام عالم کی تاریخ ہے۔ ثبوتیت پسندوں (Positivists) نے فلسفۂ تاریخ کو ایک مربوط اور جامع نظام بنا کر اس کے ذریعہ آفاقی اصول دریافت کیئے، جن کی روشنی میں انہوں نے اقوام اور تہذیبوں کی تاریخ کو بیان کیا، اور اقوام عالم اور تمدنوں کے عروج و زوال کو ان اصولوں کی روشنی میں دیکھا۔

کولنگ ووڈ ان سے علیحدہ اپنا نظریہ پیش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک فلسفیانہ ذہن کبھی بھی کسی شے (Object) کے بارے میں نہیں سوچتا، بلکہ جب وہ کسی شے کے بارے میں غور و فکر کرتا ہے تو اس شے کے بارے میں اپنے خیال پر بھی غور کرتا ہے اس غور و فکر کو فلسفہ یا سوچ کا دوسرا درجہ کہا جا سکتا ہے، یعنی ایک خیال پر خیال۔ جبکہ فلسفے کے برعکس نفسیات فکر کا پہلا درجہ ہے۔ وہ ذہن کو اسی طرح سمجھتی اور پرکھتی ہے، جس طرح حیاتیات زندگی کو۔ وہ کسی خیال اور شے میں کوئی رشتہ اور تعلق قائم نہیں کرتی بلکہ وہ خیال کو شے سے علیحدہ تصور کرتی ہے۔ جب کہ فلسفہ، خیال یا سوچ کو اس کی انفرادی حالت میں نہیں دیکھتا ہے بلکہ وہ اس شے سے تعلق کو بھی دیکھتا ہے۔

اس کے بعد کولنگ ووڈ فلسفہ میں تبدیلی پر بحث کرتے ہوئے اس کی تاریخ بتاتا ہے کہ مغربی فلسفہ کی ابتداء یونان سے ہوئی، جہاں غور و فکر کی ابتداء ریاضی کے علم سے ہوئی۔ علم ریاضی یونان میں فلسفہ کا مرکز رہا۔ لیکن قرون وسطی میں فلسفہ علم ریاضی سے علم الہیات کی

طرف منتقل ہو گیا' اور غور و فکر کا محور" انسان اور خدا" کے تعلقات پر رہا۔ سولھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک، نیچرل سائنس کے وجود میں آنے کے بعد" وہ فلسفہ کا محور بن گئی۔ لیکن اس تمام عرصہ میں انسان تاریخی نقطۂ نظر سے بھی سوچتا رہا۔ اٹھارویں صدی میں اس تاریخی نقطۂ نظر میں اہمیت پیدا ہوئی کیونکہ ریاضی' الہیات اور نیچرل سائنس انسان کے تمام مسائل حل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں۔ خصوصیت کے ساتھ ماضی کے وہ واقعات جو ایک خاص جگہ اور وقت میں وقوع پذیر ہوئے۔ ان واقعات کو ریاضی کی مدد سے نہیں سمجھا جا سکتا' کیونکہ ریاضی کی فکر اسی شے کو سمجھ سکتی ہے، جس کا زمان و مکاں میں وجود نہ ہو۔ اسی طرح علمِ الہیات کا دائرہ بھی تنگ ہو جاتا ہے' کیونکہ وہ ایک لامحدود موضوع پر غور کرتی ہے' جب کہ تاریخی واقعات محدود ہیں۔ اور نہ ہی سائنس ان مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ کیونکہ سائنس جس حقیقت کو دریافت کرتی ہے' اسے وہ مشاہدات اور تجربے کے ذریعہ جانتی ہے، جب کہ ماضی ایک روپوش اور دھندلی شے ہے' جسے ہم مشاہدات و تجربات کے ذریعہ ثابت نہیں کر سکتے' جیسے ہم سائنس کے مفروضات کو ثابت کرتے ہیں۔ اس لئے تاریخ کے واقعات اور ماضی میں ہونیوالے حادثات کو صرف فلسفۂ تاریخ کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔

تاریخ کیا ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے کولنگ وڈ کہتا ہے کہ علم الہیات اور نیچرل سائنس کی طرح تاریخ بھی فکر کا ایک نظام ہے' اور اس نظام کو سمجھنے کیلئے تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے۔ تاریخ کے اس مطالعہ کی ابتداء طالب علم ٹیکسٹ کی کتابوں سے کرتا ہے۔ یہ کتابیں اسے

احساس دلاتی ہیں کہ اس نے جو کچھ بھی پڑھا ہے وہ صحیح اور قطعی ہے۔ کیونکہ کورس کی کتابوں اور اساتذہ کی پڑھائی سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح اس کے ذہن میں قطعیت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ خود کو ان حالات سے نکال کر مضمون کو اپنے خیالات کی روشنی میں پڑھتا ہے تو اس وقت اسے احساس ہوتا ہے کہ کسی شعبے میں قطعیت نہیں اور نہ ہی کسی مضمون اور علم کو بالکل صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اس احساس سے اس کے منجمد ذہن میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور وہ گھٹن و تاریکی سے نکل کر آزاد اور روشن خیالی میں سانس لیتا ہے اور پھر تاریخی واقعات کو اپنے خیالات کی روشنی میں نئے انداز سے دیکھتا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے مضمون کو آزاد خیالات کی روشنی میں نہیں پڑھتا تو اس کا ذہن اسی طرح جامد و ساکت رہتا ہے۔

کولنگ ووڈ تاریخ کو تحقیق کی ایک قسم بتاتا ہے اور اسے سائنس کا درجہ دیتا ہے۔ کیونکہ سائنس بھی ایک نظام فکر ہے، جو ہمارے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کا جواب دیتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ سائنس ان واقعات کو جو پہلے سے وقوع پذیر ہو چکے ہیں انھیں جمع کر کے ان پر غور نہیں کرتی، بلکہ ان اشیا کی ماہیت اور ہیئت کو دریافت کرتی ہے، جنھیں ہم نہیں جانتے۔ اس لئے سائنس "ناواقفیت" سے شروع ہوتی ہے اور پھر چیزوں کی حقیقت کو دریافت کرتی ہے۔ اس لحاظ سے تاریخ بھی اس زمرے میں آ جاتی ہے کیونکہ تاریخ ماضی میں انسانی عمل سے پیدا ہونے والے سوالات کا جواب دیتی ہے اور اس انسانی عمل کو تلاش کرتی ہے جو انسان نے ماضی میں کیا تھا۔

تاریخ کی افادیت کیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اور وہ کس کام کے

لیے استعمال ہوتی ہے؟ اس کا جواب کولنگ وڈ اس طرح سے دیتا ہے:
کہ تاریخ کا مطالعہ انسان کو پہچاننے کیلئے ہے کیونکہ انسان کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ خود کو سمجھے، خود کو سمجھنے سے مراد ہے کہ انسانی ذہن اور فطرت کو سمجھے، اور یہ سمجھے کہ انسان بذات خود کیا ہے اور ہم کس قسم کے انسان ہیں اور دوسروں سے ہم کس طرح مختلف ہیں۔ اپنے آپ کو جاننے کے لئے ضروری ہے کہ ہم یہ غور کریں کہ "ہم کیا کر سکتے ہیں؟" اس سے ہم جبھی واقف ہو سکتے ہیں کہ جب ہم کچھ کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح ہم تاریخ سے یہ سیکھ سکتے ہیں کہ ماضی میں انسان نے جو کچھ کیا ہے وہ ہم اب بھی کر سکتے ہیں۔ لہٰذا تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ انسان نے اب تک کیا کیا ہے اور خود انسان کیا ہے؟
اس لئے تاریخ ایک سائنس ہے جو سوالات کا جواب دیتی ہے، اس کا تعلق ماضی میں انسان کے عمل سے ہے۔ یہ ماضی کے واقعات کی تاویل کرتی ہے اور اس سے انسان اور اس کی ذہنیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔

تاریخ کی ابتداء کس طرح سے ہوئی؟ اسے ایک علم کا درجہ کس طرح دیا گیا؟ اور کس طرح انسانی ذہن تاریخ کے احساس و شعور سے دوچار ہوا؟ اس کی تشریح کرتے ہوئے کولنگ وڈ کہتا ہے کہ: مشرق میں تاریخ کی ابتداء مذہبی قصے، کہانیوں اور دیومالائی تصورات سے شروع ہوئی جسے ہم الہیاتی تاریخ کہہ سکتے ہیں، لیکن یہ انسانی عمل کی تاریخ نہیں، کیونکہ الہیاتی اور مذہبی تاریخ میں انسان اور اس کے عمل کو دخل نہیں، اس کی حیثیت ایک آلہ کار کی سی ہے۔ دیومالائی

قصوں میں انسانی عمل سرے سے مفقود ہے۔ اس میں صرف دیوی دیوتاؤں کے قصے ہیں۔ یہ قصے کسی تاریخی بنیاد پر نہیں تخلیق ہوتے بلکہ ان کے بارے میں یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ ماضی میں ایسا ہوا ہوگا۔ ان کا دائرۂ عمل گمنام ماضی میں اور لامحدود زماں و مکاں میں سرگرم نظر آتا ہے، جس کے بارے میں کوئی قطعی اور حتمی طور پر نہیں بتا سکتا کہ یہ کیا تھا؟ درحقیقت یونانیوں نے سب سے پہلے تاریخ کو ایک سائنس کی حیثیت سے دیکھا اور سمجھا، اور انہوں نے تاریخ اور انسانی عمل کو آپس میں مربوط اور ہم آہنگ کیا۔ اس لئے یونان کی تاریخ دیومالائی قصوں اور کہانیوں پر مشتمل نہیں، بلکہ یہ تحقیق ہے اور ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کرتی ہے جس سے ہم واقف ہیں۔ یہ منع بھی نہیں اور انسان کی سرگرمیوں اور عمل کی تاریخ ہے۔ اس میں وہ واقعات نہیں جو گمنام ماضی اور لامحدود زماں و مکاں میں بغیر نام و نشان کے ہوئے ہوں گے، بلکہ وہ واقعات ہیں جو ماضی میں ایک خاص اور قطعی وقت پر وقوع پذیر ہوئے ہیں۔

یونانیوں کے ذہن میں تاریخ کا احساس، ماحول کی وجہ سے ہوا، جس میں تیزی سے تغیر و تبدل ہو رہا تھا۔ زلزلے، سیلاب اور دوسری فطری آفات زمین کے چہرے اور خدوخال کو بدل رہی تھیں۔ ان کے سامنے فطرت ایک مستقل سفر کے عمل میں تھی، چنانچہ انہوں نے اس تبدیلی کو انسانی زندگی میں بھی رواں دواں دیکھا۔ انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ انسان کی زندگی میں ٹھہراؤ، سکون اور جمود نہیں۔ اس میں کوئی قطعیت نہیں، بلکہ زندگی برابر نشیب و فراز اور مدوجزر کی شکل میں سرگرم رہتی ہے اور پھر یہ تبدیلی بھی شدید اور متضاد

ہوتی ہے۔ چھوٹے سے بڑا، فخر سے ذلت، اور خوشی سے محرومی، یہی پلاٹ ان کے ڈراموں کی جان ہوا، اور اسی پلاٹ کو انھوں نے تاریخ میں بیان کیا۔ یونانی اس لئے علمِ تاریخ کو ضروری سمجھتے تھے کہ اس سے تبدیلی کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ تبدیلی اپنے آپ کو دہراتی بھی رہتی ہے، ایک جیسے حالات میں ایک جیسے نتائج پیدا ہوتے رہتے ہیں، اس لئے اہم واقعات کو یاد رکھنا چاہئیے تاکہ ان کی روشنی میں حال کو سمجھا جائے اور خطرات سے محفوظ رہا جائے۔ اس طرح انسان اپنی تقدیر کا مالک ہو سکتا ہے۔

یونانیوں کے بعد کولنگ ووڈ نے رومیوں کے نظریۂ تاریخ پر بحث کی ہے ان کے نزدیک تاریخ ایک سلسلہ ہے، اس لئے ماضی کے ورثہ کی حفاظت کی جائے۔ اس نظریہ کے تحت رومیوں نے قدیم روایات اور اشیا کی حفاظت کی۔ دنیا نے پہلی بار رومیوں سے عالمی تاریخ یا قومی تاریخ کا تصور لیا۔ جس میں تاریخ کے اس عظیم سلسلہ کے ہیرو عوام اور ان کا جذبہ ہے۔ مشہور رومی مورخ پولی بس کے نزدیک "ہم تاریخ کے مطالعہ کے بعد ان غلطیوں سے نہیں بچ سکتے جو ہم سے پہلے انسان کر چکا ہے، لیکن ہم ان تمام مصیبتوں، تکلیفوں اور دکھوں کو بہادری سے برداشت کرنے کا سبق حاصل کر سکتے ہیں"

یونانی اور رومی نظریہ تاریخ کی خصوصیات یہ ہیں: تاریخ انسان سے متعلق ہے۔ اس میں انسان کا عمل، اس کا مقصد، اس کی کامیابی و ناکامی کا بیان ہے۔ اگرچہ اس میں دیوتاؤں کا بھی اثر ہے لیکن ان کا دائرۂ عمل محدود ہے، وہ انسانی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتے۔ اس میں انسان اپنی مرضی و خواہش سے اپنے انجام تک پہونچتا ہے،

تاریخ میں جو کچھ ہوتا ہے وہ صرف انسان کی خواہش (Wills) کے نتیجہ میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ انسان کا کردار اس کے عمل اور تجربہ کی روشنی میں تشکیل پاتا ہے اور اس کے عمل کی وسعت کے ساتھ ساتھ اس کا کردار بھی بدلتا رہتا ہے۔ انسان یہ نہیں جانتا کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ یہاں تک کہ وہ کام کر چکتا ہے۔ انسان کے عمل اس احساس سے نہیں کئے جاتے کہ وہ اسے کہاں لے جائیں گے، بلکہ وہ اس خواہش کے تحت ہوتے ہیں کہ ان کے کیا نتائج نکلیں گے۔

یونانیوں اور رومیوں کے بعد کولنگ وڈ عیسائیت کے نظریہ تاریخ پر روشنی ڈالتا ہے، جس میں انسانی عمل ناواقفیت کے اندھیرے میں ہوتا ہے۔ اس میں انسانی عمل کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نہیں ہوتا بلکہ یہ اچانک اور شدید خواہش کے زیر اثر ہوتا ہے، یہی عیسائیت میں "بنیادی گناہ" کا تصور ہے کہ انسان گناہ کو نہ تو جان بوجھ کر کرتا ہے اور نہ ہی اسے پسند کرتا ہے بلکہ یہ انسانی فطرت میں موجود رہتا ہے۔ انسان کے کارنامے، اس کی اپنی طاقت اور خواہش کے رہین منت نہیں ہوتے، اس لئے انسانی اعمال سے جو منصوبے پورے ہوتے ہیں وہ اس لئے نہیں ہوتے کہ انسان انھیں سوچتا ہے یا ان کے بارے میں فیصلہ کرتا ہے، بلکہ وہ اس لئے پورے ہوتے ہیں کہ وہ خدا کے مقصد کی تکمیل چاہتے ہیں۔ اس سے تاریخ میں یہ نظریہ پیدا ہوا کہ تاریخی عمل میں جو منصوبے تکمیل پاتے ہیں یہ انسان کے عمل سے نہیں بلکہ خدا کی مرضی اور اس کے مقاصد کو پورا کرتے ہیں۔ اس عمل میں انسان محض ایک آلۂ کار ہے۔ اس سے عیسائیت کا آفاقی نظریہ نکلتا ہے کہ خدا کے نزدیک تمام انسان برابر ہیں۔ اس کے ہاں رنگ و نسل اور قوم کا

کوئی امتیاز نہیں۔ بلکہ اس عمل میں دنیا کے تمام انسان مل کر اس کے مقاصد کی تکمیل کر رہے ہیں۔ اس لئے ہر جگہ اور ہر قوم میں ان کا عمل خدا کے منصوبے کا ایک حصہ ہے۔ اس طرح عیسائیت نے تاریخ کا آفاقی تصور پیدا کیا۔ یونان اور روم کی تاریخوں میں انسانی عمل کا محور یونان اور روم ہے، لیکن عیسائیوں کے ہاں خدا کی ذات محور ہے جس کے ارد گرد دنیا کے تمام انسان سرگرم عمل ہیں۔

روشن خیالی کے زمانے میں تاریخی تصور میں جو تبدیلی آئی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کولنگ وڈ کہتا ہے کہ اس دور میں تاریخ کو سائینٹیفک اور عقلیت کے اصولوں پر پرکھا گیا، لیکن انہوں نے ماضی کو بربریت اور توہمات کا نمائندہ قرار دے کر نظر انداز کر دیا حال پر زیادہ زور دیا گیا اور ماضی کو در خور اعتنا نہ سمجھا گیا۔ روشن خیالی کے اس تصور کے خلاف رومانوی تحریک ابھری، جس کا سرگرم رکن روسو تھا اس کے خیالات تاریخ کے نظریات میں بھی انقلاب لائے۔ اس نے حکمرانوں کے وجود سے بغاوت کی اور عوام کی حکمرانی پر زور دیا اس کے نزدیک والٹیر کے روشن خیال حکمران اس وقت تک کچھ نہیں کر سکتے جب تک کہ عوام خود روشن خیال نہ ہوں۔ لہذا "مطلق العنان مرضی" کی جگہ "عمومی مرضی" زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ یہ عمومی مرضی ہر دور اور زمانہ میں موجود رہی ہے۔ اس لئے تاریخ کو اس عمومی مرضی کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ اس تصور نے مورخوں کے ذہن کو وسعت دی، انہوں نے ماضی کو وحشت و بربریت کا نمونہ سمجھ کر نہیں، بلکہ تاریخی عمل میں اور تہذیب و ارتقاء کے عمل میں ایک کڑی سمجھ کر دیکھا۔ ان کے نزدیک تاریخی عمل ایک ہمہ گیر اور جامع تحریک ہے جو مسلسل ترقی کی جانب

رواں ہے اور جس نے انسان کو وحشت و بربریت سے تہذیب و تمدن کی بلندیوں تک پہونچایا۔

رومانوی دور کی وسعت و ہمہ گیری کی جگہ جب ثبوتیت پسند تحریک نے لی تو نظریۂ تاریخ میں پھر تبدیلی آئی، کیونکہ ثبوتیت پسندوں کے نزدیک واقعات کا تعین کرنا اور پھر ان کی روشنی میں قوانین کو ترتیب دینا اہم تصورات تھے۔ اس تحریک نے تاریخ میں زبردست اضافہ کیا۔ مورخوں نے واقعات کی چھان بین کی اور انھیں انتہائی تفصیل سے بیان کیا۔ لیکن ہوا یہ کہ واقعات کی بھرمار اور تفصیلات نے تاریخ کو خشک مضمون بنا دیا۔ ان مورخوں نے واقعات کو تو جمع کیا لیکن ان واقعات پر کوئی تبصرہ اور تنقید نہیں کی اور جب تاریخ میں یہ سوالات پیدا ہوئے کہ کیا یہ پالیسی صحیح تھی؟ کیا یہ معاشی نظام مستحکم تھا؟ اور کیا سائنس، مذہب اور آرٹ میں ترقی ہوئی؟ تو انہوں نے ان کے جوابات دینے سے احتراز کیا، کیونکہ جواب دینے کی صورت میں ذاتی رائے، فیصلہ اور نقطۂ نظر کو دخل ہوتا جو واقعات کی شکل اور ان کا تاثر بدل دیتا۔ اس لئے ثبوتیت پسندوں نے تاریخ کو صرف تاریخ سمجھ کر اس کا مطالعہ کیا، اور ان افکار کو نہیں دیکھا جنھوں نے واقعات کی تشکیل میں مدد دی۔ انہوں نے تاریخ کو صرف سیاست تک محدود رکھا اور سائنس، آرٹ و مذہب کے اثر کو محسوس نہیں کیا جس کی وجہ سے ان کا تاریخی شعور سمٹ گیا اور اس کی ہمہ گیری ختم ہو گئی۔

انسان ہر چیز کو جاننے کی کوشش کرتا ہے، وہ خود کو سمجھنے کی بھی خواہش کرتا ہے۔ کیونکہ جن اشیا کے بارے میں وہ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے

اس کا شمار بھی ان ہی میں سے ہے۔ اس لئے خود کو جانے بغیر اس کی معلومات دوسری اشیا کے بارے میں ناقص ہیں۔ خود کو پہچاننا ضروری ہے تاکہ دوسری اشیا کے بارے میں معلومات ہو سکیں۔ یہاں خود کو جاننے سے مراد جسمانی ہی نہیں بلکہ روحانی، ذہنی اور شعوری ہے، تاکہ اس طرح سے وہ اپنی صلاحیتوں، افکار، اور خیالات سے واقف ہو سکے۔

انسانی ذہن کی فطرت سمجھنے سے پہلے اس دنیا کے بارے میں واقف ہونا چاہیے کیونکہ جب ہم اس دنیا کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں خاص قسم کے واقعات نظر آتے ہیں جو ہو چکے ہیں یا ہو رہے ہیں۔ اس کے بعد ہم ان واقعات کو سمجھتے ہیں کہ وہ کس طرح ایک دوسرے سے متعلق نظر آتے ہیں۔ واقعات کے آپس کے تعلق اور رشتہ کو "فطری قوانین" کہا جاتا ہے۔ ان قوانین کی روشنی میں نہ صرف ہم واقعات کو سمجھ سکتے ہیں، بلکہ ان کا تعین بھی کر سکتے ہیں۔ انسانی ذہن کو بھی سمجھنے کا ایک یہی طریقہ ہے۔ پہلے ہم یہ دیکھیں کہ کن حالات میں ہمارا ذہن ردعمل کا شکار ہوتا ہے اور اس کا اثر کیا ہوتا ہے، اس کے بعد ہم ان قوانین کی تشکیل کر سکتے ہیں جو ذہن اور اس کے عمل کو متحرک رکھتے ہیں۔ فطرت کو سمجھنے کا بہترین طریقہ سائنس ہے، اور انسانی ذہن کو سمجھنے کا تاریخ ہے۔

کولنگ ووڈ فطری اور تاریخی عمل میں تضاد پاتا ہے۔ فطرت کا عمل ایک واقعہ کے بعد دوسرا واقعہ پیدا کرتا رہتا ہے، لیکن تاریخی عمل واقعات ہی پیدا نہیں کرتا، بلکہ ان واقعات کی تہہ میں گہری فکر بھی پیدا کرتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مورخ صرف واقعات ہی کو بیان نہیں کرے بلکہ اس فکری عمل کو بھی دیکھے جو واقعات کی گہرائی میں رواں ہیں۔ تاریخ کا یہ صحیح نقطۂ نظر ہے اور اسی وجہ سے تاریخ کو فکر کی تاریخ کہا جاتا ہے۔

فطری عمل اور تاریخی عمل میں فرق اس مثال سے سمجھ میں آتا ہے کہ جب ایک سائنسدان پوچھتا ہے کہ "کاغذ کا یہ ٹکڑا زرد کیوں ہوا؟" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کن موقعوں پر کاغذ زرد ہو جاتا ہے یا کن مرحلوں سے گذرنے کے بعد اس پر زردی آتی ہے۔ اور جب ایک مورخ پوچھتا ہے کہ "بروٹس نے سیزر کو کیوں قتل کیا؟" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بروٹس نے کیا سوچا؟ کہ جس کی وجہ سے وہ سیزر کو قتل کرنے پر تیار ہوا۔ مورخ کے نزدیک واقعہ کے وقوع ہونے کی وجہ وہ خیال ہے جو اس شخص کے ذہن میں پیدا ہوا، جس نے آلہ کار بن کر واقعہ کو تشکیل دی یہی تاریخ میں ہر واقعہ کا داخلی پہلو ہے۔

مورخ کیلئے ضروری ہے کہ جب وہ واقعات کو بیان کرے تو ان کے داخلی پہلو سے بھی پردہ اٹھائے، اس فکر کو دیکھے جو ان واقعات کی تہہ میں پوشیدہ ہے، اس عمل کو دیکھے جو واقعات کو پیدا کرتا ہے۔ مورخ کیلئے یہ کام انتہائی اذیت ناک اور دشوار ہے کیونکہ واقعات کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ اپنے آپ کو اسی ماحول میں ڈھال لے اور اپنی شخصیت کو اسی شخصیت میں ضم کر دے جس کا وہ بیان کر رہا ہو مثلاً جب ایک مورخ سیزر کی تاریخ لکھتا ہے، اور اس کی جنگوں اور سیاست پر تبصرہ کرتا ہے تو اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ یہ سوچے کہ سیزر کے ذہن میں کیا خیالات تھے جس کی وجہ سے وہ عمل پر مجبور رہا، مورخ خود کو انہیں حالات میں ڈھال کر غور کرے کہ، ان حالات میں سیزر نے جو کچھ کیا تھا کیا وہ صحیح تھا یا غلط؟ اس کے بعد وہ اس کی تاریخ کو بہتر طریقہ سے سمجھ سکتا ہے اور اس سے بہتر نتائج نکال سکتا ہے۔ اس فکر کی تاریخ پہلے مورخ کے ذہن میں تشکیل پاتی ہے، اسی کے زیر اثر مورخ

ماضی کے افکار کو دوبارہ تشکیل دیتا ہے، جس سے فکری تاریخ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

مورخ تاریخی علم کو صرف انسانی معاملات تک محدود رکھتا ہے کیونکہ فطری عمل واقعات کا عمل ہے، جبکہ تاریخ کا عمل فکر کا عمل ہے۔ اس لئے انسانی تاریخ عمل کا موضوع ہے، کیونکہ انسان وہ حیوان ہے جو سوچ سکتا ہے اور اس کی سوچ میں برابر اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ لیکن انسان کے تمام عمل تاریخ کا موضوع نہیں ہوتے، اس کے کچھ عمل تاریخی ہوتے ہیں اور کچھ غیر تاریخی، جو انسانی اعمال حیوانی فطرت کی وجہ سے ہوتے ہیں جیسے بھوک، پیاس، اور نیند وغیرہ، یہ غیر تاریخی عمل ہیں، کیونکہ یہ فطرت کا عمل ہے اس لئے یہ مورخ کے لئے دلچسپی کا باعث نہیں کہ انسان سوتا ہے، کھاتا ہے، محبت کرتا ہے اور اپنی فطری بھوک اور خواہشات کو پورا کرتا ہے اس سے قطع نظر مورخ ان سماجی، معاشی اور معاشرتی رسومات، روایات اور اقدار میں دلچسپی لیتا ہے جنھیں انسانی معاشرہ تشکیل کرتا ہے اور جن کے پس منظر میں معاشرہ کی فہم و ادراک پیدا ہوتی ہے۔

کولنگ وڈ کے نزدیک ایک مورخ صرف ان واقعات کو بیان کرے جو داخلی طور پر فکر کے حامل ہوں۔ واقعات کا بیان صرف اس حد تک ہو جس حد تک ان میں فکر ہو، کیونکہ یہی صحیح اور اصل تاریخ ہے۔ محض واقعات کے انبار کو ترتیب اور سلیقہ کے ساتھ جمع کرنے سے کوئی تاریخی شعور پیدا نہیں ہوتا۔

تاریخی تحقیق مورخ کو اپنے ذہن کی قوت کا احساس دلاتی ہے، کیونکہ وہ تاریخی علم کو اس کی گہرائیوں میں جاکر دیکھتا ہے اور جب بھی وہ تاریخی عمل کو نہیں سمجھ پاتا، یا اس کی گہرائیوں میں نہیں اتر پاتا تو اس وقت

اسے اپنے ذہن کی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔ بعض اوقات کچھ مورخ یا مورخوں کی پوری نسل تاریخ کے کسی دور یا زمانہ کو نہیں سمجھ پاتے اور اسے "تاریک دور" کہنے لگتے ہیں۔ حالانکہ اس تاریکی کا تعلق زمانہ سے نہیں بلکہ ان کے ذہن سے ہوتا ہے جو زمانہ کی وسعتوں کو نہیں سمیٹ پاتا۔

فطرت اور تاریخ کے عمل میں ایک فرق یہ ہے کہ تاریخی عمل سے جو مافیہ پیدا ہوتا ہے وہ ایک زندہ، متحرک اور جاندار مافیہ ہوتا ہے۔ مثلاً یونانیوں نے علم ریاضی میں جو تخلیق کی وہ موجودہ ریاضی کی بنیاد بن گئی۔ ان تبدیلیوں نے تاریخی فکر کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملائیں اور فکر کی اس زنجیر کو برابر متحرک رکھا۔ لیکن فطری عمل ذہنی طور پر اثر انداز نہیں ہوتا اور نہ ہی فطری تجربات سے دوسرا فایدہ اٹھاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کھانا کھاتا ہے یا پانی پیتا ہے، لیکن اس کے اس فطری عمل سے دوسرے شخص کو کوئی جسمانی توانائی نہیں پہونچتی۔ لیکن اگر کوئی شخص غور و فکر کرتا ہے تو اس سے دوسرے ذہن بھی متاثر ہوتے ہیں اور تاریخ اس ذہنی و شعوری فکر کو محفوظ رکھ کر اسے دوسروں تک پہونچاتی ہے، کیونکہ فکر تاریخی عمل میں ہے اور تاریخ کا عمل فکر کا عمل ہے اس لئے تاریخی علم محض تفریح یا وقت گزاری کے لئے نہیں بلکہ یہ وہ علم ہے جو ذہن و شعور کو فہم و ادراک بخشتا ہے۔

کولنگ وڈ تاریخ کی بنیاد دو چیزوں پر قرار دیتا ہے: یادداشت اور اعتبار۔ اگر کوئی واقعہ تاریخی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ کوئی اس سے واقف ہو، اور واقف کار اسے

یاد بھی رکھے۔ اور اپنی یادداشتوں کی مدد سے، اسے واضح اور صاف الفاظ میں دوسروں سے بیان کرے، اس میں صداقت بھی ہونی چاہیئے تاکہ دوسرے اسے صحیح تسلیم کریں۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ واقعہ کو صحیح تسلیم کرنیوالا مورخ ہوا، اور جس کی بات پر یقین کیا گیا وہ اتھارٹی ہوئی۔

مورخ کا کام یہ ہے کہ وہ اتھارٹی کے بیان کو دیکھے، کہ کونسا حصہ کمزور ہے اور کہاں بیان میں حالات سے مطابقت نہیں۔ واقعات کو کن حالات اور کس ماحول میں لکھا گیا، اور اس کے پس منظر میں کیا مقاصد تھے۔ اس کے بعد مورخ واقعات کی تشریح کرے، اور ان کا تنقیدی جائزہ لے۔ مورخ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اتھارٹی کے بیان کو بالکل صحیح تسلیم نہیں کرے، بلکہ اس بات کو دیکھے کہ اس نے کن اہم چیزوں کو نظرانداز کر دیا ہے اور کن باتوں کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ مثلاً: ایک کمانڈر اپنی رپورٹ میں جنگ کو فتح قرار دیتا ہے۔ جب مورخ اس پر تنقیدی نظر ڈالتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ اگر یہ فتح تھی تو پھر اس کے نتائج کیوں دوسرے برآمد ہوئے۔ یہاں وہ کمانڈر کی غلط بیانی کو پکڑ لیتا ہے کہ اس نے اپنی رپورٹ میں کچھ حقائق کو چھپایا ہے۔ اگر وہ اس طرح تجزیہ نہ کرے تو وہ بھی مورد الزام ٹھہرے گا کہ اس نے رپورٹ کو صحیح سمجھ کر بیان کر دیا اور اس پر تنقیدی نظر نہیں ڈالی۔

بعض اوقات تاریخ کا انحصار نہ تو اتھارٹی پر ہوتا ہے اور نہ یادداشت پر، کیونکہ مورخ تک تاریخ اس صورت میں پہونچتی ہے کہ نہ تو کوئی بیان ہوتا ہے اور نہ شہادت و روایت۔ اب مورخ کو یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ آیا یہ واقعات ہوئے بھی تھے یا نہیں۔ یہ فیصلہ وہ اس تحقیق کے بعد کرتا

ہے۔ جس میں آثار قدیمہ کے نشانات اور نوادرات اس کی رہنمائی کرتے ہیں مورخ ان نشانات اور نوادرات کی مدد سے تاریخی واقعات کو تشکیل دیتا ہے اور واقعات کو جوڑ کر ان سے تاریخ بناتا ہے۔

اس مرحلہ پر یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ کے ذریعہ کس طرح حقیقت تک پہونچا جائے؟ کیونکہ مورخ اتھارٹی کے بیان کو تسلیم کرکے بیان تو کر دیتا ہے، مگر ساتھ ساتھ اس شبہ کا اظہار بھی کرتا ہے کہ حقیقت میں جو کچھ ہوا وہ یہ نہیں بلکہ شاید کچھ اور ہو۔ اس کا جواب براڈلے اس طرح سے دیتا ہے کہ "ہمیں دنیا کے تجربات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ واقعات خاص ماحول میں ہوتے ہیں اور کچھ نہیں ہوتے۔ ان تجربات کی روشنی میں مورخ اس بات پر غور کرے کہ اتھارٹی کا بیان صحیح ہے یا غلط۔ اگر نتائج اس کے تجربات کے مطابق ہوں تو وہ واقعات صحیح ہیں ورنہ نہیں"۔

کولنگ ووڈ براڈلے کے اس نقطۂ نظر سے اختلاف کرتا ہے۔ کیونکہ اس نقطۂ نظر سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کیا وقوع پذیر ہوا؟ بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ کیا ہونا چاہیئے؟ چونکہ یہ نہیں بتایا جاتا کہ کیا ہوا؟ اس لئے ہمیں اپنی معلومات پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے اور ہم اپنی معلومات پر یقین کرتے ہوئے اس کو اتھارٹی کی معلومات پر منطبق کرتے ہیں، اس سے اتھارٹی کی مخالفت صرف منفی حد تک ہوتی ہے۔

کچھ مورخ اپنے تجربہ کو تاریخ سے بلکہ فطرت سے اخذ کرتے ہیں۔ جبکہ فطرت کوئی تاریخ نہیں رکھتی، کیونکہ فطرت کے قوانین یکساں ہوتے ہیں۔ اس لئے جو چیز آج فطرت کے خلاف ہے وہ دو ہزار قبل بھی اس کے خلاف تھی۔ لیکن تاریخی لحاظ سے انسان میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ ان میں یکسانیت نہیں اور ان کے نتائج بھی ہمیشہ مختلف ہوتے ہیں۔

کولنگ وڈ تاریخ کے لئے تخیل کو ضروری سمجھتا ہے، کیونکہ تاریخ میں جگہ جگہ خلا یا شگاف ہیں۔ اس لئے مورخ کے لئے ضروری ہے کہ اپنے تخیل کی مدد سے تاریخ کے ان شگافوں کو بھر سکے تاکہ رکاوٹیں دور ہوں اور تاریخ واضح اور صاف شکل میں وجود میں آئے۔ تاریخ میں کس قسم کے خلا ہوتے ہیں؟ اس کی مثال دیتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ مثلاً اگر تاریخ میں یہ لکھا ہے کہ سیزر ایک دن روم میں تھا اور چند دن بعد گال (Gaul) میں، تو مورخ کے ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ آخر ان بقیہ دنوں میں وہ کہاں تھا؟ جو روم اور گال کے درمیان میں آتے ہیں۔ اب مورخ کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے تخیل کی مدد سے اس خلا کو پر کرے کہ ان دنوں سیزر نے کیا کیا؟ وہ کن کن مقامات سے گذرا۔ ان سوالات کے جواب سے وہ اس خلا کو بھر سکے گا جو تاریخ میں موجود ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے سمندر میں ایک جہاز کو دیکھتے ہیں، پھر پانچ منٹ آنکھیں بند کر کے دوبارہ اسے دیکھتے ہیں تو وہ ہمیں دوسری جگہ نظر آتا ہے۔ اب ہم اپنے تخیل کی مدد سے اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس پانچ منٹ کے عرصے میں، جب ہم نے اسے نہیں دیکھا، اس وقت جہاز کس جگہ ہوگا۔ بالکل اسی طرح ہم تاریخ میں جو جگہیں خالی ہیں انہیں پر کر سکتے ہیں۔

بری (Bury) کہتا ہے کہ تاریخ سائنس ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ کولنگ وڈ اس کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سائنس کے معنی ہیں کسی بھی علم کو ترتیب کے ساتھ پیش کرنا۔ اس لحاظ سے تاریخ کو سائنس کہنا صحیح ہے۔ لیکن یہ سوال غور طلب ہے کہ تاریخ سائنس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ کیونکہ کوئی علم جب سائنس ہوتا ہے تو وہ ایک خاص

قسم کی سائنس میں شمار ہوتا ہے، کیونکہ علم کے کسی پہلو کی ایک خاص انداز اور طریقہ سے منظم کیا جاتا ہے۔ مثلاً علم موسمیات جو ان واقعات اور مشاہدات پر مبنی ہوتا ہے جیسے سائنسداں وقوع پذیر ہوتے ہوئے دیکھتا ہے، اگرچہ وہ انھیں اپنی مرضی سے پیدا نہیں کر سکتا۔ یا علم کیمیا جو صرف مشاہدہ ہی نہیں کرتا بلکہ واقعات کو خاص حالات کے تحت پیدا بھی کرتا ہے۔ لیکن تاریخ ان میں سے کسی بھی طریقے پر ترتیب نہیں دی جاتی۔ جنگ اور انقلابات جو مورخ کا موضوع ہوتے ہیں وہ کسی تجربہ گاہ کی پیداوار نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ ان واقعات کا اس طرح سے مشاہدہ کرتا ہے جیسے سائنسداں تجربات اور مشاہدات سے فطرت کے مستقل قوانین دریافت کرتے ہیں۔ مورخ تاریخ میں کوئی مستقل قانون اور وجہ دریافت نہیں کرتا، کیونکہ تاریخ ایک ایسی سائنس ہے جو ان واقعات کا مشاہدہ کرتی ہے جو ہمارے مشاہدے سے دور ہیں۔ وہ ان واقعات کا استخراجی مطالعہ کرتی ہے اور ان پر اس طریقہ سے بحث کرتی ہے جو مشاہدہ کی پہنچ تک ہیں۔ اسے مورخ شہادت (Evidence) کہتا ہے۔

کولنگ وڈ سوانح حیات کو تاریخ تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ اس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ فکر کے علاوہ اور کوئی تاریخ نہیں۔ اس لئے سوانح حیات اگرچہ تاریخی عنصر رکھتی ہے، لیکن اس کے بنیادی اصول غیر تاریخی ہوتے ہیں، بلکہ ایک لحاظ سے تاریخ سے متضاد ہوتے ہیں۔ سوانح حیات کا موضوع صرف محدود واقعات ہوتے ہیں جو ایک انسان کی زندگی میں پیش آتے ہیں۔ اس لئے اس کی بنیاد اور ڈھانچہ فکر پر نہیں بلکہ فطری عمل پر ہوتا ہے اور اس کے گرد آدمی کی جسمانی زندگی، اس کا بچپن، شباب، بوڑھاپا، بیماریاں،

اور حادثات ہوتے ہیں ۔ اگرچہ اس عمل کے پہلو بہ پہلو اس کی اپنی اور دوسروں کی فکر بھی ہوتی ہے، لیکن بنیادی چیز انسانی جذبات ہیں اور سوانح حیات انسانی جذبات کی ترجمان ہوتی ہے ۔ اس میں انسانی تجربات، جذبات، اور خواہشات ہوتی ہیں، یہ کسی ایک شخصیت کی ترجمانی تو کر سکتی ہے مگر یہ تاریخ نہیں ہو سکتی ۔

کولنگ ووڈ تاریخ میں صرف انہیں سرگرمیوں اور انسانی اعمال کو جگہ دیتا ہے جو کسی مقصد کے تحت وقوع پذیر ہوئے ہوں ۔ بامقصد انسانی عمل تاریخ کا موضوع ہوتے ہیں ۔ اس میں خصوصیت سے سیاست کو اولیت حاصل ہے ۔ کیونکہ یہ ایک بامقصد عمل ہے جو ایک سیاستداں کے ہاتھوں پورا ہوتا ہے ۔ ہر سیاستداں اپنا نقطۂ نظر رکھتا ہے ۔ اس پر اپنی پالیسی ترتیب دیتا ہے اور اس پالیسی کو ایک سوچے سمجھے منصوبہ کی حیثیت سے پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ اسی طرح معاشی سرگرمیاں بھی تاریخی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں ۔ جب آدمی فیکٹری لگاتا ہے یا بنک کا کاروبار کرتا ہے تو اس کے پیچھے ایک مقصد ہوتا ہے اور اس مقصد میں وہ لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جو اس ذریعہ سے روزی کماتے ہیں ۔ اس کی چیزیں خریدتے ہیں یا بنک میں پیسہ جمع کراتے اور نکلواتے ہیں ۔ اخلاقی تاریخ کی بنیاد بھی مقصد پر ہے جو خواہشات اور آزادی کو معاشرہ کی فلاح و بہبود کے لئے محدود کرتی ہے ۔ افراد فرض کی ادائیگی حادثاتی طور پر نہیں کرتے بلکہ اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں اس کی اہمیت کا احساس دلایا جاتا ہے ۔

کولنگ ووڈ نے اپنے تاریخی نظریات میں جس چیز کو واضح کیا ہے وہ یہ ہے کہ تاریخ فطرت سے آزاد ہے ۔ وہ عمل جس کے اثر جس کی قوت

اور جس کے زور سے انسان تاریخی تبدیلیاں لایا ہے اس کے پسِ منظر میں کوئی طاقت اور قوت نہیں۔ تاریخ آزادی سے اپنے منصوبوں کو پورا کرتی ہے۔ تاریخی نکر نیچرل سائنس کے دباؤ سے آزاد ہے وہ ایک خودمختار سائنس ہے جس کا اپنا عمل، قوانین اور فکری نظام ہے۔ تاریخ ایسی سائنس ہے جو انسانی زندگی کے ہر پہلو کو سمیٹ کر ترتیب دیتی ہے، اس لئے انسان کی ذہنی و شعوری ترقی میں، اس کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔

رینائر

جی۔ جے۔ رینائر بیسویں صدی کا مورخ ہے۔ تاریخ کے بارے میں اس نے اپنے خیالات کا اظہار مشہور کتاب: History its Method and Practice میں کیا ہے۔ اس نے اس بات کا جائزہ لیا ہے کہ تاریخ کس طرح بنی؟ کس طرح اس میں ترتیب آئی؟ اور کس طرح اس کا تعلق انسانی ذہن سے ہوا؟ اور عملی زندگی میں تاریخ کس کام آسکتی ہے؟ اس نے اس اہم سوال کا بھی جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ کیا تاریخ آج کی سائنسی و فنی زندگی میں کوئی انقلابی کردار ادا کرسکتی ہے؟

رینائر نے تاریخ کی افادیت و اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے اس کی تعریف اس طرح کی ہے کہ: انسان کیلئے یادداشت کا ہونا انتہائی لازمی اور ضروری ہے، کیونکہ یہ یادداشت اس کے شعور، عقل وفہم اور

اور غور و فکر کے لئے ضروری ہے۔ انسان بغیر یادداشت کے نہ تو کوئی فیصلہ کر سکتا ہے اور نہ ہی اپنی حالت سدھار سکتا ہے۔ اگر انسان ابتداء میں صرف غور و فکر کرتا تو یہ اس کیلئے انتہائی مہلک ہوتا، کیونکہ غور و فکر عمل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتا ہے۔ اس صورت میں اس کے لئے جانوروں سے مقابلہ کرنا اور اپنا وجود برقرار رکھنا ناممکن ہو جاتا۔ یہ اس کی حرکت، عمل، اور تیزی تھی جس نے خونخوار جانوروں کو شکست دی اور اس نے اس نے ابتدائی دور میں کامیابی حاصل کی۔

انسان نے غور و فکر سے زیادہ عمل پر کیوں زور دیا؟ اس لئے کہ آدمی کی خواہشات بھوک، پیاس، اور تھکن کے بعد آرام کی شدید خواہش نے اسے مجبور کیا کہ وہ حالات سے مقابلہ کرے اور اس کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں انہیں دور کرے۔ کیونکہ انسان کی خواہشات کا تعلق اس کے ذہن سے ہے، اس لئے ہر انسان اپنی خواہشات کا غلام ہوتا ہے۔ اس تصادم اور کشمکش میں انسان نے تجربات کے ذریعہ یہ سیکھا کہ کچھ حالات میں عمل سے گریز کیا جائے اور کچھ حالات میں صرف مشاہدہ کیا جائے، حالات و واقعات کو پرکھا جائے۔ بعض حالات میں سوچے سمجھے بغیر یا مشاہدہ کئے بغیر عمل کیا جائے۔ بعض وقت جب اسے کوئی مشکل مرحلہ پیش آتا ہے یا کوئی عقدہ لاینحل اور پیچیدہ مسئلہ اسے پریشان کرتا ہے تو اس وقت وہ سوچتا ہے کہ کیا ماضی میں بھی کبھی ایسا ہی واقعہ اور مسئلہ پیش آیا تھا؟ اور اس وقت اس نے کیا کیا تھا؟ کس طرح اس نے ان مسائل کو حل کیا تھا؟ اور اس میں اسے کس حد تک کامیابی ہوئی تھی؟ اس سوچ بچار کے

کے بعد وہ عمل کرتا ہے ۔ اس سے ثابت ہوا کہ انسان نے اپنے عمل کی بنیاد "تجربات" پر رکھی ہے ۔ ماضی کے ان تجربات کو ذہن میں محفوظ رکھنے کیلئے "یادداشت" کا ہونا ضروری ہے ۔ یادداشت کو بہتر طریقے سے کام میں لانیکیلئے غور و فکر اور سوچنا لازمی ہے ۔ اس لیے انسانی زندگی جس قدر پیچیدہ ہوگی، اسی قدر اس کے حل کیلئے اور مسائل کو دور کرنے کیلئے جدوجہد اور غور و فکر کی ضرورت ہوگی ۔

یادداشت کا کام یہ ہے کہ وہ ماضی کے تجربات کو ذہن میں جمع کرتی ہے جو اسے اپنے آباؤ اجداد سے زندگی کے مختلف حصوں میں بطور وراثت ملتے ہیں ۔ یہ "یادداشت" بالکل صحیح صحیح ہر چیز کو محفوظ نہیں رکھتی اور تجربات کو جلا بھی دیتی ہے، کیونکہ ہر انسان کی یادداشت مختلف ہوتی ہے ۔ کوئی کم یاد رکھتا ہے اور کوئی زیادہ ۔ لیکن اس کمزوری کے باوجود ہم اسے اپنے احساسات و تجربات کی حفاظت گاہ سمجھتے ہیں ۔

انسانی معاشرہ ایک فرد کی طرح ہے جب اسے مشکلات پیش آتی ہیں تو وہ ماضی کے تجربات کی طرف دیکھتا ہے ۔ اسی وجہ سے بیکن کہتا ہے کہ "تاریخ آدمی کو عقل مند بناتی ہے" لیکن فرد کے مقابلے میں معاشرے کیلئے یادداشت رکھنا بہت مشکل ہے، کیونکہ اس کے پاس کوئی نامیاتی (Organic) یا نسلی قسم کی کوئی یادداشت نہیں ہوتی جس سے وہ ماضی کے تجربات کو اکٹھا کرے، انھیں محفوظ کرے اور جب بھی ضرورت پڑے تو ان تجربات میں سے کسی تجربہ کا استعمال کرے ۔ اس لئے معاشرہ کا ہر فرد اپنے جانشین کو اپنے تجربات بیان کرتا ہے اور در حقیقت یہی "بیانات" معاشرے کی یادداشت ہوتے ہیں ۔ یہ بیانات بہادری کے واقعات، قصے، کہانیاں،

گیت اور اقوال میں ہوتے ہیں۔ جب معاشرہ کو یہ احساس ہوا کہ ان بیانات سے قوم پرستی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تو انھوں نے یہ کام مخصوص لوگوں کے سپرد کر دیا کہ وہ انھیں ترتیب اور قاعدہ سے محفوظ رکھیں اور پھر اسے آنیوالی نسل کو منتقل کر دیں۔ یہ بیانات آگے چل کر تاریخ میں تبدیل ہوئے اور ان کے لکھنے والے مورخ کہلائے۔ ان مورخوں نے ہر آنیوالے واقعہ کو جو قحط ہو، زلزلہ ہو، یا دشمن کے مقابلہ میں محاصرہ کی حالت ہو، یا فتح و شکست ہو، اسے تفصیل سے لکھا تاکہ آنے والی نسل ماضی کے ان واقعات کی واقفیت حاصل کرے، خوشی و مسرت سے لطف اندوز ہو۔ بعد میں ان بیانات کی ہر دور میں توضیح و تشریح ہوتی رہی اور ان پر تنقید کی گئی، اس لئے بایر (Bauer) کہتا ہے کہ:

"ہر زمانے کی تاریخ کا تصور علیحدہ بنیاد پر ہوتا ہے"

ہر فرد کو اپنے ماضی سے دلچسپی ہوتی ہے۔ گذرے ہوئے لمحات اس کے لئے خوشی و مسرت یا رنج و اندوہ کی متحرک تصویریں ہوتی ہیں۔ اس کا ایک ایک نقش اس کے ذہن پر ثبت ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے ماضی سے نکل کر اپنی قوم اور معاشرہ کے ماضی میں آتا ہے تو اس وقت بھی اس کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ کیونکہ اس وسیع و عریض اور گنجلک ماضی میں اس کا ماضی بھی شامل ہوتا ہے۔ معاشرے کی اقدار، روایات اور رواداری اسی کی ذات کی وسعت ہوتے ہیں اور ان ہی کے ذریعے وہ ماضی کے خزانوں سے متعارف ہوتا ہے۔ اسی لئے کسی نے کہا ہے کہ: "تمام ماضی میرا ماضی ہے اور میں تسکین کی خاطر اسے دیکھنا چاہتا ہوں" اس سے ثابت ہوا کہ فرد کا جذبۂ نرگسیت اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ ماضی کے دریچوں میں جھانک کر دیکھے۔ ماضی کے واقعات سے والہانہ محبت کرے،

ان پر فخر کرے، ان سے خوشی و انبساط حاصل کرے یا ان کو یاد کر کے غم و اندوہ، اور اداسی سے دوچار ہو ۔ ماضی سے یہ لگاؤ، محبت صرف ماضی کی خاطر نہیں ہونا چاہیے بلکہ حال کیلئے بھی ہونا چاہیے، ماضی کے خزانوں سے جو کچھ بھی حاصل کیا جائے ان کی مدد سے مستقبل کو محفوظ اور پائیدار بنایا جائے۔

انسانی تاریخ انسانی تجربوں کی کہانی ہے ۔ یہ تجربات منفی بھی ہیں اور مثبت بھی۔ اس لئے ان کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ انسانی ذہن کو سمجھا جائے ۔ جس قدر انسانی ذہن کو سمجھا جائے گا، اسی قدر اچھی تاریخ ہوگی اور اسی قدر وسیع نقطۂ نظر ہوگا۔

موجودہ زمانے میں تاریخ کو کئی قسموں میں تقسیم کر دیا گیا ہے مثلاً: سیاسی تاریخ، دستوری تاریخ، معاشی تاریخ، پارلیمانی تاریخ، سماجی تاریخ اور فنی تاریخ ۔ لیکن ان سب میں سیاسی تاریخ خصوصیت کی حامل ہے کیونکہ اس میں انسان اپنی عظمت اور شان و شوکت کی خاطر جدوجہد کرتا نظر آتا ہے ۔ سیاسی تاریخ میں کھیلا جانے والا ڈرامہ ذہن کو سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے ۔ اس میں خون ریز جنگیں بھی ہیں تو شجاعت و بہادری کے محیر العقول کارنامے بھی اور خیرہ کرنے والے شان و شوکت کے مظاہرے بھی ۔ یہی وجہ ہے کہ والٹیر، گبن، آگسٹس تھیری، مکالے اور رانکے نے سیاسی تاریخ میں دلچسپی لی۔ سیاسی تاریخ کے وسیع اسٹیج پر قومیں اپنی تقدیر بناتی نظر آتی ہیں ۔ اس لئے آج بھی سیاسی تاریخ سب سے زیادہ دلچسپ اور سب سے زیادہ اہم سمجھی جاتی ہے ۔ تاریخ کے دوسرے پہلو سیاسی تاریخ کے پس منظر میں جلوہ دکھاتے نظر آتے ہیں۔ جب تک کسی دور کے سیاسی نظام کو نہیں سمجھا جائے گا اس وقت

تک اس دور کی معاشی، سماجی، فنی اور دستوری تاریخ کو نہیں سمجھا جائے گا۔

کیونکہ انسانی تاریخ انسان کے متعلق ہے اس لیے مورخ اپنے اردگرد کے حالات کو دیکھتا ہے اور اپنے ساتھی انسانوں کے ذہن، کردار اور عادات کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس صورت میں، اس علم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، وہ ماضی کو بہتر طریقہ سے سمجھتا ہے۔
ایک مورخ کے نقطۂ نظر سے اگر انسانی ذہنیت ایک سی نہ ہوتی تو انسانی تاریخ بڑی پیچیدہ اور ناقابلِ فہم ہوتی۔ اسی خیال کو دانعول فرانس ذرا تبدیلی سے بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد سے بہت کم مختلف ہیں۔ ہماری دلچسپی و اصطلاحات میں اگر کوئی تبدیلی ہو تو اس کیلئے ضروری ہے کہ ہمارے جسمانی مسامات و اعضاء میں بھی تغیر و تبدل ہو۔ اگر جسم میں معمولی تبدیلی ہوتی ہے تو یہ کام صدیوں میں پورا ہوتا ہے۔ اس لیے انسانی کردار میں صدیوں و ہزاروں برس کے بعد تبدیلی آتی ہے۔
لیکن ایک دوسرا فلسفی اور مورخ کولنگ ووڈ اس کی شدید مخالفت کرتا ہے۔ اس کے نزدیک انسانی ذہن تبدیل ہوا ہے اور تبدیل ہوگا جب دنیا کی تمام چیزوں میں تبدیلی ہوتی ہے اور ہر شے تغیر کا شکار ہے تو صرف انسانی ذہن اس سے کیوں کر مبرا ہو سکتا ہے کیونکہ انسانی ذہن کوئی جامد و ساکت شے نہیں ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ ابتدائی زمانے میں جب انسان کا فطرت سے مقابلہ تھا تو اس وقت اسے طاقت و قوت درکار تھی، وہ مضبوط کردار کا

حاصل ہوا کرتا تھا۔ ایک انسان پوری جماعت کو اپنے قابو میں رکھتا تھا جماعت کے تمام افراد اس کے تابع و فرماں بردار تھے۔ قرون وسطیٰ میں چاہے وہ ولی ہو، یا نائٹ، یا دستکار، سب معاشرے میں مل جل کر رہتے تھے اور اجتماعی نقطۂ نظر سے ہر کام کرتے تھے۔ جب کہ موجودہ دور کا انسان انفرادیت پر زور دیتا ہے۔ اس انفرادیت نے اس کی پوری شخصیت اور کردار کو تبدیل کر دیا ہے۔

سولہویں صدی کے آدمی کی اعصابی قوت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ مذہبی امور میں اذیتوں کو خوشی خوشی برداشت کرتا تھا، جبکہ بیسویں صدی کا آدمی انجکشن اور انستھیزیا کے بغیر کوئی تکلیف برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کا جواب ماہر تعلیمات اور فلسفی اس طرح دیتے ہیں کہ جب لوگوں میں نظریہ کا اعتقاد ہو اور وہ اپنے آپ کو حق پر سمجھیں تو اس صورت میں وہ ہر تکلیف کو برداشت کر سکتے ہیں۔ جیسے کیمونسٹ جنھوں نے مقصد کی خاطر خوشی خوشی تمام اذیتیں برداشت کیں۔ اس لئے یہ سوال کہ انسانی ذہن تبدیل ہوا ہے یا نہیں، اس کا جواب بھی تاریخ کے صفحات میں نظر آ جاتا ہے۔

ادب اور ڈرامے میں انسانی جدوجہد کے مناظر پیش کئے جاتے ہیں لیکن ان میں تاریخ کی طرح واقعات کی سچائی نہیں ہوتی۔ اگرچہ ادب اور ڈرامے میں جو کچھ پیش کیا جاتا ہے وہ معاشرے اور فرد کی تاریخ ہوتی ہے۔ لیکن یہ تاریخ تخیل کی پیداوار ہوتی ہے اور اس کی مدد سے مصنف یا ڈرامہ نویس انسانی کردار کے متعلق اپنی رائے دیتا ہے۔ شاعر، مصنف اور فنکار کا کام یہی ہے کہ وہ اپنے فن کے ذریعہ انسانی ذہن

کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ لیکن تاریخ میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے اس میں ٹھوس اور اٹل حقیقت ہوتی ہے۔ سبب علت، تخیل اور انسانی کردار کی فہم، تاریخ کے ضروری عناصر ہیں جن سے مل کر تاریخ بنتی ہے۔ اس لئے تاریخ صرف تخیل کی ایجاد نہیں، بلکہ مورخ اپنی معلومات اور تجربوں کی بنیاد پر ماضی میں ہونیوالے واقعات و حالات کو آپس میں ملاتا ہے، ان کی توضیح و تشریح کرتا ہے اور پھر اس سے نتائج نکالتا ہے۔

جب کوئی مورخ ان تاریخی واقعات کو بیان کرتا ہے تو اس میں اس کی ذاتی رائے، اس کا سیاسی و مذہبی نقطۂ نظر ضرور شامل ہوتا ہے اور بعض حالات میں مورخ ایک خاص ذہن و خیال کے سانچہ میں تاریخ کو ڈھالتا ہے۔ اس لئے ہر تاریخ مذہبی، وسیاسی و نسلی رنگ میں رنگی نظر آتی ہے۔

جب تاریخ میں ہونے والے واقعات کو غور و فکر سے پرکھا جاتا ہے، ان کی توجیح پیش کی جاتی ہے اور انہیں ترتیب دے کر ان سے کوئی نتیجہ نکالا جاتا ہے تو پھر یہ "فلسفۂ تاریخ" بن جاتا ہے۔ کیونکہ تاریخ میں صرف بیان ہوتا ہے، جب اس بیان کے اسباب و علل پیش کئے جائیں اور کسی خاص نقطۂ نظر سے ان پر تنقید کی جائے یا ان کی تشریح کی جائے تو پھر یہ فلسفۂ تاریخ ہو جاتا ہے۔

تاریخ کے ہر نظریہ میں یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ تمام واقعات ایک ترتیب، سلسلہ اور نظام کے تحت عمل پذیر ہو رہے ہیں۔ اس لئے ترتیب وار واقعات کا دہرانا "قانونِ تاریخ" کے دائرے میں آ جاتا ہے جو، قوانین

فطرت کی مانند ہوتے ہیں، کہ جہاں ایک واقعہ کے بعد دوسرا واقعہ ہونا لازمی ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے؟ اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ انسان نے جو تجربات ماضی میں کئے وہ دہرائے جائیں گے۔ اگر تاریخ کو ایک سلسلہ مان لیا جائے کہ ابتداء سے اب تک اور آئندہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ تاریخ کا ایک طویل سلسلہ ہے جو ایک کڑی سے دوسری کڑی سے ملا ہوا چل رہا ہے۔ تو اس صورت میں یہ کہنا کہ سلسلہ لوٹ کر پھر واقعات دہرائیں گے غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ سلسلہ ہمیشہ آگے بڑھے گا، اس میں تسلسل ہوگا، اس تسلسل کو روک دینا یا ختم کر دینا، انسانی ترقی کو ختم کر دیتا ہے۔ تاریخ میں کچھ واقعات پیدا ہوتے ہیں، وہ دوسرے واقعات و حالات پر اثر انداز ہوتے ہیں جو اس سے مماثلت و مشابہت رکھتے ہیں۔ پھر یہ واقعات آنیوالے واقعات کو متاثر کرتے ہیں، اس لئے ہر واقعہ دوسرے واقعہ سے مضبوطی سے ملا ہوا ہے اور ہر واقعہ دوسرے واقعہ سے مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے تاریخ واقعات کا سلسلہ ہوتی ہے جو برابر آگے کی جانب رواں دواں رہتی ہے۔ اس صورت میں تاریخ بار بار نہیں دہراتی بلکہ مضبوطی سے آگے کی جانب قدم بڑھاتی ہے۔

ایک اہم سوال عام طور سے یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مورخ پیشین گوئی کر سکتا ہے؟ تاریخ کا مطالعہ ہر فرد کو اس بات کا موقع دیتا ہے کہ وہ ماضی کی روشنی میں حال اور مستقبل کو سمجھ سکے۔ تاریخ کے مطالعہ کے بعد اس کی نگاہ دور رس ہو جاتی ہے اور پھر وہ حالات کو وسیع نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اسمیڈ بلوک کہتا ہے کہ "ماضی کا وسیع علم مورخ کو یہ موقع فراہم

نہیں کرتا کہ وہ مستقبل کے بارے میں صحیح صحیح پیشین گوئی کر سکے، لیکن یہ علم اسے زمانۂ حال کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے اور زمانۂ حال کو سمجھنے کے بعد مستقبل کے بارے میں اندازہ ہو سکتا ہے۔"

کیا مورخ جب تاریخ لکھنے بیٹھے تو اس وقت وہ اپنی رائے، تجربہ، خیالات جذبات و احساسات کو اس سے علیحدہ رکھے؟ مورخوں کا ایک گروہ اس کا حامی ہے کہ تاریخ میں نظریات کا پرچار نہ ہو، ذاتی رائے و خیالات کا دخل نہ ہو۔ کیونکہ تاریخ بھی سائنس کی طرح ہے اس لئے مورخ کا فرض ہے کہ واقعات کو جانچ اور پرکھ کر انہیں صرف بیان کر دے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں دوسرا گروہ شدت سے اس کا مخالف ہے۔ ان کے نزدیک مورخ اپنی ذات کو علیحدہ نہیں رکھ سکتا، کیونکہ مورخ کا موضوع معاشرہ ہوتا ہے اسے ان واقعات کو بیان کرنا اور پھر انہیں سمجھنا پڑتا ہے جس کا وہ خود ایک حصہ ہوتا ہے۔ اس لئے معاشرہ اور قوم سے وہ اپنے وجود اور ذات کو علیحدہ نہیں کر سکتا، اس کی ذات کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو، وہ سماجی روایات سے فرار نہیں ہو سکتا، اس لئے مورخ کا فرض ہے کہ وہ پہلے سے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کر دے تاکہ قاری اسی نقطۂ نظر سے تاریخ کا مطالعہ کرے۔

ای۔ ایچ۔ ڈانس

ای۔ ایچ۔ ڈانس بیسویں صدی کا انگریز مورخ ہے
جس نے یورپ اور انگلستان کی تاریخ پر کتابیں لکھیں۔
تاریخ کے بارے میں اپنے نظریات کا اظہار

History the Betrayer

میں کیا ہے۔ اس کے نزدیک تاریخ انسان کو حقیقت سے
دور لے جاتی ہے۔ تعصب، وطن پرستی، اور نسلی برتری
کے احساسات تاریخ کو مسخ کرتے ہیں۔ اس لئے ایسی تاریخ
انسانوں میں باہمی نفرت، دشمنی، عناد اور دوری کا سبب
بنتی ہے۔

تاریخ کے ذریعہ حقیقت کی تلاش ایک ناممکن امر ہے۔ سچائی اور حقیقت
تاریخ میں مختلف نقطہ ہائے نظر کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتی ہے

یا مذہب اور رنگ و نسل کے گل ہائے رنگیں میں روپوش ہو جاتی ہے۔
تاریخ حقیقت کی منزل کے اتنے راستے دریافت کرتی ہے کہ حق کا متلاشی
ان راہوں میں ہمیشہ بھٹکتا رہتا ہے۔ اور منزل دور سے دور ہوتی جاتی
ہے۔

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ماضی میں تبدیلی کسی طرح ممکن نہیں۔ اس
کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ تاریخ ماضی کا نام ہے۔ لیکن تاریخ ماضی کا نام
نہیں بلکہ زمانہ ماضی میں ہونیوالے واقعات کا نام ہے۔ اگر ان واقعات
کا کوئی ریکارڈ نہ ہو تو تاریخ کے صفحات سادہ نظر آئیں گے۔ اس
لئے اس ریکارڈ کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک ریکارڈر کی ضرورت ہے
جب وہ اسے محفوظ کرتا ہے، ترتیب دیتا ہے، اس کے معانی اور
مطالب کو واضح کرتا ہے تو اس وقت اس کے ذاتی خیالات اور
تعصب کا رنگ ان واقعات پر چڑھ جاتا ہے جس کی وجہ سے ان
کی ہیئت و ماہیت بدل جاتی ہے۔

اس لئے ڈائس کے نزدیک تاریخ واقعیت پسند نہیں ہو سکتی۔ تاریخ
دانوں کی مثال عدالت میں کھڑے ہوئے ان گواہوں کی مانند ہوتی ہے
جو ایک ہی واقعہ کو مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں۔ جب ایک
واقعہ کتنے ہی رنگوں میں رنگا جائے اور اس کی بار بار مختلف انداز
سے توضیح و تشریح کی جائے تو اس صورت میں حقیقت و اصل واقعہ
ان لاتعداد پردوں میں لپٹ کر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور جزئیات
پر بحث ہوتی رہتی ہے۔

اس صورت حال سے بچنے کے لئے مورخوں کا ایک گروہ اس بات پر
زور دیتا ہے کہ اگر تاریخ کو سنہ و سال کے ذریعہ بیان کیا جائے تو

اس صورت میں اسے واقعیت پسند بنایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں ذاتی رائے اور نقطۂ نظر کو دخل نہیں ہوگا۔ لیکن یہ رائے بھی صحیح نہیں ہے۔ اس کی مثال دیتے ہوئے ای۔ ایچ ڈالنس لکھتا ہے کہ: تاریخوں میں لکھا ہے کہ ہاسٹنگ کی جنگ ۱۰۶۶ میں ہوئی تھی۔ لیکن اس میں دو غلط بیانیاں ہیں: اول تو جنگ ہاسٹنگ میں نہیں اس سے چھ یا سات میل دور ہوئی تھی۔ اس لئے کچھ مورخوں نے اس بات کی تحریک شروع کی کہ اس کا نام ہاسٹنگ سے بدل کر "سین لیک" (Senlac) رکھ دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ یہ ۱۰۶۶ میں نہیں بلکہ ۱۰۶۹ سے ۱۰۷۴ کے درمیان ہوئی تھی۔ کیونکہ عیسیٰؑ کی پیدائش ہمارے کلینڈر کے مطابق آگسٹس کے ۳۱ویں سال میں نہیں ہوئی تھی بلکہ اس سے پہلے ہوئی تھی جب کرے نیس (Cyrenius) شام کا گورنر تھا۔

عیسوی سنہ کی اس غلطی کی وجہ سے نہ صرف مغربی تاریخیں سنہ وسال کی لحاظ سے غلط ہیں، بلکہ یہ غلطیاں وہاں بھی رواج پا گئیں جن ملکوں نے عیسوی سنہ کو اختیار کر رکھا ہے۔ عیسوی سنہ کے پرانے اور نئے کلینڈر میں جسے پوپ گریگوری نے ترتیب دیا۔ بڑا فرق ہے۔ اس فرق کی وجہ سے عیسوی سنہ میں ۲ سے ۸ سال تک کا فرق پڑ جاتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے دوسرے ملکوں میں یا ماضی میں کوئی بھی ایسا طریقہ نہیں جس سے ہم ماہ وسال کا صحیح صحیح حساب لگا سکیں۔ اہل یونان اپنا حساب اولمپک کھیلوں سے رکھتے تھے، اہل روم کا حساب شہر روم کی تعمیر کی تاریخ سے چلتا تھا اور مسلمانوں نے ہجرت کو اپنا سنہ قرار دیا۔ جس میں چاند کی تاریخوں سے

حساب رکھا جاتا ہے۔ انقلاب فرانس میں پرانے طریقوں کو ختم کر کے انقلابی حکومت نے اپنا سنہ شروع کیا۔ چینیوں نے دو ہزار سالہ شہنشاہیت کے زمانے میں، ہر شہنشاہ کی تخت نشینی سے ایک نیا سال شروع کیا۔ یہی طریقہ ہندوستان میں مغلوں کا تھا۔

یہ تمام طریقے معیار کے مطابق نہیں اور جب انھیں مغرب میں سنہ عیسوی میں تبدیل کیا گیا تو یہ اور بھی معیار سے گر گئے۔ اسی وجہ سے مصر کی تاریخ میں بڑی الجھن پیدا ہوئی، کیونکہ ان کے سال میں ۳۶۵ دن نہیں ہوتے تھے بلکہ ۱/۴ ۳۶۵ دن ہوتے تھے۔ عیسوی سال سے مصری تہذیب کی مدت ۱۴۶۱ سال ہوئے جس کی وجہ سے مصری تہذیب کے ماہر دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے جو ۱۴۶۱ سال کی تاریخ کو مختلف تاریخوں اور سنوں میں لکھ رہے ہیں۔

اس تحقیق کے بعض دلچسپ نتائج نکلتے ہیں۔ مثلاً حمورابی کا دورِ حکومت نئی تحقیق کے بعد دو سو سال اوپر چلا گیا۔ الفرڈ دی گریٹ کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ ۹۰۱ء میں مرا۔ لہٰذا اس کی وفات کی تاریخ کے حساب سے اس کی ایک ہزار سالہ برسی منانے کا اہتمام کیا جا رہا تھا کہ کسی نے دریافت کیا کہ اس کی اصل تاریخ وفات ۸۹۹ء یا ۹۰۰ء ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام تقریبات منسوخ ہو گئیں اور تاریخ کی تمام کتابوں میں سنہ کی تبدیلی کی گئی۔ اسی طرح ۲۳ اپریل کو شیکسپیئر کا یوم پیدائش بڑی شان و شوکت سے منایا جاتا ہے، لیکن حقیقت میں اس کی صحیح تاریخ پیدائش کا علم کسی کو نہیں۔

اس سے یہ چیز واضح ہو کر آئی کہ تاریخ کو واقعیت پسند بنانے کے لئے سنہ و سال کا سہارا کسی کام کا نہیں۔ اس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے

کہ تاریخ کو سنہ و سال کے ڈھانچے ڈھالنے کے باوجود اس میں تعصب پوری طرح سمو دیا جاتا ہے۔ سچ بولنے کا سب سے سہل طریقہ یہ ہے کہ سوائے سچ کے اور کچھ نہیں بولا جائے۔

"Easies way of telling the truth is to speak nothing but truth."

مثلاً تاریخ کی دو کتابیں جو برطانیہ اور جرمنی میں لکھی گئی ہیں ان میں سنہ و سال کے ذریعہ اس طرح تاریخ لکھی ہے:

برطانیہ کی تاریخ میں:

۵۱۰۔ میں ڈوڈلے اور امپسن کا قتل

۵۱۲ ۔ فرانس سے جنگ اور بریسٹ کے مقام پر فرانسیسی بیڑہ کی تباہی

۵۱۳ ۔ انگلینڈ اور فرانس کی جنگ۔ فرانس کی شکست

۵۱۴ ۔ فرانس اور اسکاٹلینڈ میں صلح۔

۵۱۵ ۔ وولزے کا کارڈینل اور چانسلر بننا۔

۵۲۱ ۔ ہنری ہشتم کو پوپ کی جانب سے مذہب کے محافظ کا خطاب۔

جرمنی کی تاریخ میں:

۱۵۰۰ ۔ اٹلی میں نشاۃ ثانیہ کی ابتداء۔

۱۵۱۷ ۔ مارٹن لوتھر اور تحریک اصلاح مذہب۔

۱۵۲۰ ۔ جرمنی کی سائنسی و فنی ترقی

۱۵۲۴ ۔ کسانوں کی جنگ۔

ان دونوں کتابوں میں ۱۵۰۰ سے لے کر ۱۵۲۵ تک کی معلومات دی گئی ہیں لیکن ان دونوں میں ایک بھی چیز مشترک نہیں، کیونکہ دونوں تاریخیں دو مختلف نقطہ ہائے نظر کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ برطانوی تاریخ

پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزوں نے ہمیشہ فرانسیسیوں اور ارکاٹ لینڈ والوں کو شکست دی ہے ۔ ان تاریخوں کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ ان میں اپنے ملک کے واقعات کو بڑی اہمیت دی ہے جبکہ دنیا میں ہونیوالے اہم واقعات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے ۔

جرمنی کی تاریخ میں برطانیہ کے بارے میں کوئی ایک لفظ نہیں اور نہ ہی اس میں یورپ کے سیاسی و معاشرتی واقعات کا کوئی ذکر ہے ۔ لیکن دونوں تاریخوں میں کیے کے علاوہ اور کچھ نہیں ۔ پھر بھی دونوں تاریخیں تعصب کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں ۔ اسی طرح مشرقی جرمنی میں جو تاریخیں لکھی گیئں ہیں، ان میں اسی زمانے کے واقعات کچھ اس طرح سے ہیں :

۱۵۰۰ ۔ پاشا کا زوال

۱۵۱۰ ۔ پین لین نے جیب گھڑی ایجاد کی

۱۵۱۲ ۔ غریب کونارڈ کا انقلاب

۱۵۱۶ ۔ ٹامس مور کی یوٹوپیا ۔

۱۵۱۷ ۔ لوتھر

۱۵۲۰ ۔ سوئٹزرلینڈ میں تحریک اصلاحِ مذہب

۱۵۲۲ ۔ کسانوں کی بغاوت ۔ بابر کا ہندوستان فتح کرنا ۔

اس پتہ چلتا ہے کہ ان واقعات کو بڑی خوبی سے مارکسی نقطۂ نظر سے منتخب کر کے ان کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے ۔

لہٰذا ان تاریخوں سے، اور اس کے ذریعے دی جانے والی اطلاعات سے ایک خاص قسم کے ذہن و شعور کی پرورش ہوتی ہے ۔ اس قسم کی تاریخیں پوری نسل میں تعصب دشمنی اور نفرت کے جذبات کو پروان

جڑ جاتی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ اسکول کے طالب علموں کے لئے جو کتابیں لکھی جاتی ہیں ان میں یہ تعصب پوری شان سے ہوتا ہے۔ کیونکہ کتاب جس قدر مختصر ہوگی اسی قدر اس میں کم انتخاب ہوگا اور اسی قدر اس میں تعصب ہوگا۔ لیکن یہ بات اسکول کی کتابوں ہی تک محدود نہیں رہی، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھی۔ گبن، مکالے۔ لورڈ ایکٹن جی نے بھی تاریخ کو اپنے نقطۂ نظر میں ڈھال کر بیان کیا ہے۔ اس کی وجہ سے تاریخ پروپگنڈے کا ایک ذریعہ بن کر رہ گئی۔ کیونکہ ہر تاریخ کی کتاب کسی خاص مقصد کی تشہیر کے لئے لکھی جاتی ہے۔ اس لئے یہ کتابیں ایک نسل میں تو بڑی مقبول ہوتی ہیں اور لوگ انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں لیکن دوسری نسل کے لوگ انھیں فراموش کر دیتے ہیں جیسے مکالے، سیلی، اور گرین کی تاریخیں۔ کیونکہ انھوں نے یہ تاریخیں اپنے زمانہ اور ماحول کے مطابق لکھیں، جب حالات بدلے تو ان کی وقعت بھی ختم ہوگئی۔ یہی حال موجودہ زمانہ کی تاریخوں کا ہوگا، کیونکہ ان میں کوئی آفاقی قدر نہیں، وسیع نقطۂ نظر نہیں، وسعت و جامعیت نہیں، اس لئے یہ آنیوالی نسلوں کے مزاج اور نظریہ کے خلاف ہوں گی اور اپنی اہمیت کھو دیں گی۔ نازی، فاشسٹ اور کمیونسٹ نظریہ کے تحت جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں نظریہ کا رنگ گہرا ہے۔ اس لئے تاریخ کی کتابیں لکھتے وقت انھوں نے صرف انھیں واقعات کو منتخب کیا جن سے ان کے نظریہ کو تقویت ملی۔ وہ ایمانداری کے ساتھ اس نقطۂ نظر کو صحیح بھی سمجھتے ہیں۔

اسی ذہنیت کے ساتھ انگریزوں نے تاریخ کی کتابیں لکھیں، مثلاً "انگلستان کی وسعت" (Expansion of England)

سامراجی نقطۂ نظر سے لکھی گئی اور اسے انگریزوں نے صحیح سمجھ کر بڑی خوشی سے پڑھا۔ اس لئے نازیوں، فاشسٹوں، کمیونسٹوں اور انگریزوں کے طریقہ میں کوئی فرق نہیں۔ صرف نقطۂ نظر میں فرق ہے۔ جب برطانوی و امریکی مورخ اپنی تاریخ کی کتابوں میں جمہوریت و پارلیمانی طرزِ حکومت کی طرف داری کرتے ہیں تو امریکی و برطانوی عوام اس سے خوش ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر جمہوریت کا پروپگنڈا جائز ہے تو ہمیں اشتراکیوں پر کیا اعتراض ہے۔ اگر ایک امریکی مورخ جمہوری اقدار کی ستائش کرتا ہے اور ایک روسی اشتراکی نظریہ پیش کرتا ہے تو پھر ایک دوسرے کو تنگ نظر اور متعصب کہنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ دونوں کے خیالات و افکار میں جو فرق ہے اس کی وجہ بھی تاریخ کی کتابیں ہیں۔

تاریخ میں ایک ہی واقعہ کی جدا جدا اور مختلف تفصیل ملتی ہے، کیونکہ ہر قوم اپنے نقطۂ نظر سے اس واقعہ کو بیان کرتی ہے۔ مثلاً اسپین کی تاریخ میں آرمیڈا کی شکست موسم کی خرابی کی وجہ سے ہوئی۔ جرمنی کی تاریخوں میں کریمیا کی جنگ کے سلسلہ میں برطانیہ کا کوئی ذکر نہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اشتراکی ملکوں میں جو تاریخیں لکھی گئیں ان میں اتحادی طاقتوں کا ذکر بہت کم ہے۔

ہر قوم اپنے انداز سے سوچتی ہے اور یہی انداز اس کا تاریخ میں جھلکتا ہے ہر قوم اپنی طاقت، شجاعت اور بہادری کو مبالغہ کی حد تک بیان کرتی ہے۔ مثلاً جب جنگ صد سالہ کے حالات برطانیہ میں لکھے جاتے ہیں تو اس میں "سلیز کریسی" "پوائیٹیر" اور "اگن کورٹ"

تو جنگوں کا ذکر تفصیل سے ہوتا ہے۔ جب فرانس میں یہی حالات لکھے جاتے ہیں تو اس میں برٹرانڈ کے دفاعی حربے، جان آف آرک کی بہادری اور فرانسیسی فتوحات کی تفصیلات ہوتی ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انگریز طالب علم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ انگریز فرانسیسیوں سے زیادہ بہادر ہیں۔ اور فرانسیسی طالب علم فرانسیسیوں کو انگریزوں سے برتر سمجھتا ہے۔ حالانکہ انگریز طالب علموں کو اس پر تعجب ضرور ہوتا ہے کہ انگریزوں کی بہادری اور فتوحات کے باوجود آخر وہ کیوں فرانس سے نکال دئے گئے۔!

جب "اسپین کی جانشینی" کا حال انگریزی تاریخوں میں ہوتا ہے تو اس میں "بلین ہائم" "رامیلی" "مال پلاکے" کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کون تھے اور ان کے کیا کارنامے تھے؟ اسی طرح فرانس کی کتابوں میں "سابرو" کی سرگرمیاں نظر نہیں آتیں۔ اس صورت میں دونوں ملکوں کے طالب علم یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا ملک نتیجہ یاب ہوا اور دونوں صحیح ہیں کیونکہ اس جنگ کے نتیجہ میں فرانس کا امیدوار اسپین کا بادشاہ ہوا، اور برطانیہ نے نوآبادیات میں اضافہ کیا۔ کچھ یہی حال نپولین کی جنگوں کا ہے۔ انگریزی تاریخیں "ٹرافلگر" اور "واٹرلو" کی تفصیل سے بھری پڑی ہیں جب کہ اس کی دوسری فتوحات کو یا تو نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا بہت ہی معمولی انداز میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ایک تاریخ کی کانفرنس میں جب سوال اٹھا کہ واٹرلو کی جنگ کا اصلی ہیرو کون تھا؟ تو اس کے جوابات بڑے دلچسپ آئے: برطانیہ، امریکہ اور اٹلی نے ویلنگٹن کو ہیرو قرار دیا۔ مغربی جرمنی نے

بلوشر کو، فرانس نے پہلے بلوشر کو اور پھر ویلنگ ٹن کو؛ ڈنمارک نے پہلے ویلنگ ٹن کو اور بلوشر کو، آسٹریلیا اور ناروے نے دونوں کو برابر کا قرار دیا۔ بلجیم کے مورخ نے کہا کہ ویلنگ ٹن کی کمانڈ ضرور تھی لیکن اصل فتح کی وجہ بلجیم کا ایک جنرل تھا، جس نے ویلنگ ٹن کے حکم کے باوجود پسپائی اختیار نہ کی اور آخر کار جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ اس فرق اور اختلاف کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہر قوم صرف انہیں واقعات کا انتخاب کرتی ہے جو اس کے حق میں ہوں اور دوسرے تمام واقعات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ تمام قوموں میں ایک چیز کی کمی نظر آتی ہے کہ وہ دوسروں کی خوبیاں نہیں دیکھتیں۔

ہماری تاریخ کی ایک اور خرابی یہ ہے کہ ہم نے اسے مختلف دوروں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ مثلاً قدیم، قرونِ وسطیٰ، اور جدید۔ قدیم تاریخ رومی شہنشاہیت کے خاتمہ پر ختم ہو جاتی ہے اور جدید دور کا آغاز نشاۃ ثانیہ سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا درمیانی حصہ قرونِ وسطیٰ میں آتا ہے۔ لیکن کچھ مورخوں کے نزدیک جدید کی اصطلاح لایعنی ہو گئی کیونکہ جدید زمانہ سترھویں صدی سے لے کر موجودہ زمانہ تک آ گیا۔ اس لئے اس زمانہ کے لئے "درمیانی زمانہ" کی اصطلاح وضع کی گئی لیکن اسے برطانیہ کے علاوہ دوسرے ملکوں نے تسلیم نہیں کیا۔ اس سلسلہ میں ایک الجھن اور پیدا ہوئی کیونکہ مغربی یورپ کے علاوہ دوسرے حصوں میں نہ تو رومی شہنشاہیت کا خاتمہ ہوا، اور نہ ہی تحریک نشاۃ ثانیہ ابھری، اس لئے ان کے ہاں قرونِ وسطیٰ کا کوئی زمانہ نہیں ہونا چاہئیے۔ بازنطینی شہنشاہیت میں "درمیانی دور" کی کوئی ابتداء

نہیں' مشرقی یورپ میں تو جدید زمانہ اب شروع ہوا ہے - اس لحاظ سے افریقہ اور ایشیا کی پوری تاریخ نئے ادوار میں تقسیم ہو گی جس سے اہل مغرب قطعی ناواقف ہوں گے ۔

اشتراکی ملکوں' خصوصیت کے ساتھ روس اور چین میں "تاریخ کو نئے ، ادوار میں تقسیم کر دیا گیا ہے - یعنی تاریخ میں صرف دو ادوار ہیں قدیم اور جدید - قدیم و جدید زمانے کو جدا کرنے والا واقعہ ان کے ہاں خانہ جنگی ہے' جس میں امراء کا زوال ہوا اور درمیانی طبقہ کو اختیارات ملے۔

بہت سے مورخ تحریک نشاۃ ثانیہ اور تحریک اصلاح مذہب کو چنداں اہم نہیں سمجھتے ، ان کے نزدیک سترھویں صدی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے ، کیونکہ اس صدی میں ہونے والے واقعات نے تاریخ میں انقلابی تبدیلیاں کیں - برطانوی پارلیمنٹ نے بادشاہ کو قتل کیا ۱۶۴۸ء اور ۱۶۵۹ء میں یورپ کی طاقتوں کا معاہدہ ہوا' جس نے ہیپسبرگ (Hapsburg) کا اثر ختم کیا ، اور فرانس کی قوت و طاقت کو بڑھایا اس دور میں پرشیا (Prussia) پہلی مرتبہ طاقت بن کر ابھرا ، ہالینڈ اور سوئٹزرلینڈ کو پہلی مرتبہ بحیثیت طاقت کے تسلیم کیا گیا - دوسری جانب ذہنی و فنی اور سائنسی ترقی بھی اسی صدی میں ہوئی ، ۱۶۴۲ء میں گلیلیو کی وفات ہوئی اور نیوٹن پیدا ہوا - بیکن نے سائنس کو تجربات کی بنیاد پر سیکھنے کو کہا - پورے یورپ میں سائنس کی اکاڈیمیاں بنیں - نوآبادیاتی نظام کی ابتداء ہوئی - صنعت و حرفت میں ترقی ہوئی - بحیرہ روم کا اثر ختم ہوا ، اور اٹلانٹک کے اقتدار کا زمانہ شروع ہوا ۔

بدقسمتی سے سترھویں اور اٹھارویں صدی کے مورخوں نے تاریخ لکھتے وقت صرف سیاست پر زور دیا اور دوسرے تمام شعبوں کو نظر انداز کر دیا۔ اس صدی کا کارل مارکس صرف ایسا مورخ اور فلسفی ہے جس نے معیشت کے پہلو کو اجاگر کیا۔ اب تک ہمارے مورخ تاریخ لکھتے وقت سائنس، صنعت وحرفت اور فنی وتکنیکی پہلوؤں پر زور نہیں دے رہے ہیں۔

ہماری تاریخوں میں جو تنگ نظری آئی ہے اور اسے قومی ونسلی ومذہبی تعصب سے لکھا گیا ہے اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ تاریخ کے طالبعلم کو نہ صرف اپنے ملک، بلکہ دوسرے ملکوں اور قوموں کی تاریخ ان کے کارناموں اور ان کی ترقی سے واقف ہونا چاہیے۔ ایشیا اور افریقہ میں جو واقعات ہوئے ان کا علم اہل مغرب کو ہونا ضروری ہے۔ اہلِ مغرب کو یہ بات بھی سمجھنی چاہیے کہ صرف عیسائیت عظیم مذہب نہیں بلکہ اس کے علاوہ دوسرے مذاہب بھی ہیں اور ان کی اخلاقی قدریں بھی اتنی ہی عظیم ہیں جتنی عیسائیت کی۔ جب تک تاریخ میں بین الاقوامی تصور اور نظریہ نہیں ہوگا، اس وقت تک ذہن میں وسعت وکشادگی نہ ہوگی۔ جن علماء اور مفکرین نے انسانیت کی تبلیغ کی وہ بھی تاریخ کے ہاتھوں ناقدری کا شکار ہیں۔ ہماری تاریخوں میں گروشس، پین، بنیتھم، کانٹ اور وکٹر ہیوگو کا ذکر ایک آدھ صفحہ میں ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ہیروڈوٹس تاریخ کا بانی ہے جب ہیروڈوٹس نے دوسرے ملکوں کا سفر کیا تو اسے جو جگہیں اور چیزیں پسند آئیں ان کا ذکر کیا، جو زیادہ پسند آئیں ان کا ذکر تفصیل سے کیا، اور جو چیز اسے

پسند نہیں آئی اسے نظر انداز کر دیا یا معمولی انداز میں اس پر لکھا۔ یہی کچھ حال ہماری تاریخ کا ہے، جو ہیرو ڈوٹس کے اس اصول پر آج تک عمل پیرا ہے۔

کروچے

بینی ڈیٹو کروچے ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوا۔ روم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی ۱۹۱۵ء میں وہ سینیٹر مقرر ہوا، اور ۱۹۲۱ء میں وہ اٹلی کا وزیر تعلیم ہوا۔ جب اٹلی میں مسولینی برسرِ اقتدار آیا، تو اس نے فاشزم کی سخت مخالفت کی۔ ۱۹۵۲ء میں اس کی وفات ہوئی۔ کروچے کی تصانیف تاریخ اور فلسفہ دونوں علوم میں ہیں۔ "جمالیات" "منطق" "تاریخ اس کا نظریہ اور عمل" اس کی مشہور کتابیں ہیں۔

تاریخ سائنس ہے یا آرٹ؟ کروچے اس موضوع پر تفصیل سے بحث کرتا ہے اور اس بات کی سختی سے مخالفت کرتا ہے کہ تاریخ سائنس ہے۔ اس کے نزدیک تاریخ آرٹ ہے کیونکہ جس طرح آرٹ

نہ تو لذت دیتا ہے اور نہ ہی لذت کو اپنے میں سموتا ہے، نہ ہی یہ فطرت کے رازوں اور حقائق سے پردہ اٹھاتا ہے، نہ ہی یہ فطرت کی نمائندگی کا دعویدار ہے اور نہ ہی یہ باہمی تعلقات کو خوشگوار بنانے میں حصّہ لیتا ہے۔ آرٹ ان تمام تصورات سے ہٹ کر فرد کی وجدانی کیفیت کا نام ہے۔ آرٹسٹ اس انفرادی کیفیت کو محسوس کرتا ہے اور اس کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس لئے آرٹ دیکھنے یا محسوس کرنے والے عمل کا نام ہے۔ سائنس اس کے برعکس ایک عمومی علم ہے، اس لئے یہ عمومی تعلقات پیدا کرتی ہے اور پھر ان میں رشتہ و تعلق قائم کرتی ہے۔

آرٹ اور سائنس کی اس تعریف کے بعد کروچے تاریخ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تاریخ انفرادی واقعات کا نام ہے اور ان واقعات کا بیان اور ان کی وجوہات تاریخ میں فکر پیدا کرتی ہیں۔ اگر محض اس بیان کی وجہ سے یا واقعات کی ترتیب اور مربوط سلسلہ کی وجہ سے تاریخ کو سائنس کہا جائے تو یہ ایک بنیادی غلطی ہوگی، کیونکہ صرف بیان تاریخ کو سائنس بنانے میں مدد نہیں دے سکتا، کیونکہ بیان میں کسی واقعہ کا تجزیہ کرنے کے بعد اس کی تفصیلات دی جاتی ہیں، جبکہ سائنس میں کسی شے کو تجربہ کے بعد بیان کیا جاتا ہے۔ سائنس اور تاریخ میں اس بیان کی نوعیت بالکل جدا اور مختلف ہوتی ہے: سائنس داں جب کسی شے کا تجزیہ کرتا ہے یا کسی واقعہ کا مشاہدہ کرتا ہے تو انھیں وہ عام قوانین کے تحت ثابت کرتا ہے لیکن تاریخ میں بیان کو کسی قانون کے تحت پابند نہیں کیا جاتا ہے۔ اس میں موضوع کو نہیں دیکھا جاتا، بلکہ اس کے بارے میں غور و فکر کیا جاتا ہے۔ اس لئے تاریخ وجدان اور فرد کی اس کیفیت کی

نمائندگی کرتی ہے۔ اس لحاظ سے اس میں اور آرٹ میں مماثلت ہے لیکن تاریخ ایک خاص قسم کا آرٹ ہے۔ دوسرے آرٹسٹ جو محسوس کرتے ہیں اسے بیان کرتے ہیں، مورخ بھی یہی کرتا ہے، لیکن مورخ دوسرے آرٹسٹوں کے برعکس اس پر یقین رکھتا ہے کہ اس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ سچ اور حقیقت ہے۔ کروچے منطقی طرزِ استدلال سے بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیا آرٹ مجموعی طور پر اس کی نمائندگی کرتا ہے جو چیز وقوع پذیر ہو چکی ہے؟ اس لئے کہ جو چیز ہو چکی ہے وہ ناممکن نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ عملی طور پر تشکیل پذیر ہو چکی ہے۔ حقیقت اسی میں پوشیدہ ہے جو ممکن ہو۔ حقیقت ممکن میں ہے اور تاریخ اس حقیقت کو بیان کرتی ہے۔ اس لئے تاریخ وہ آرٹ ہوتی ہے جو ممکن کا بیان کرتی ہے۔ لیکن آرٹ خالص وجدانی ہے، اس میں فکر نہیں ہوتی جب حقیقت کو ممکن شے سے امتیاز کرنے کے لئے سوچنا پڑتا ہے تو اس صورت میں تاریخ کو "حقیقت کا وجدان" کہا جا سکتا ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے تو اس کی حدود آرٹ سے بڑھ جاتی ہیں۔ اس کروچے کے نزدیک تاریخ نہ تو کسی قانون کو دریافت کرتی ہے اور نہ ہی بناتی ہے اور نہ ہی یہ تصورات تخلیق کرتی ہے۔ یہ صرف بیان کرتی ہے۔

حق و باطل میں فرق و امتیاز فکر کے ذریعہ کیا جاتا ہے اور تاریخ میں جب واقعات کو جمع کر کے، ان پر غور و فکر کر کے ان کی حقیقت کو بیان کیا جاتا ہے تو اس میں فکر شامل ہو جاتی ہے تاریخ بغیر فکر کے واقعات کی وضاحت، توجیح اور تشریح نہیں کر سکتی، لیکن اگر تاریخ کو صرف بیان سے نکال کر فکر کا درجہ دیدیا جائے تو یہ آرٹ نہیں رہتی اس کا

دائرہ اس سے بڑھ جاتا ہے۔ اس کے ذہن میں اور زیادہ کشادگی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فلسفی اور مفکر دو قسم کے فیصلے کرتے ہیں: ایک آفاقی اور دوسرا انفرادی۔ لیکن کروچے حقیقت کی اس تقسیم کے خلاف ہے اس کے نزدیک آفاقی اور انفرادی حقیقت ایک ہے۔ اس لئے تاریخ کا فیصلہ آفاقی ہوتا ہے۔ مثلاً تاریخ میں اس جملہ کو پڑھا جائے:

"لوئی XI اور فرڈی نینڈ نے اپنے جرائم کے باوجود فرانس اور اسپین کو مستحکم کیا، جس کی وجہ سے یہ دونوں قومیں انتہائی طاقت ور بن گئیں"۔ اس جملہ سے یہ بات واضح ہے کہ مصنف اور قاری جرائم، قوم، طاقت ور اور اس قسم کی دوسری اصطلاحوں کو سمجھتے ہیں اور اپنے ذہن میں اخلاقی و سیاسی اقدار کا شعور رکھتے ہیں۔ ان ہی سیاسی و اخلاقی اقدار کے ذریعے ہم اس تاریخی حقیقت کو دریافت کرتے ہیں جو لوئی XI اور فرڈی نینڈ کے ذریعہ تکمیل کو پہونچی، اس لئے صرف تاریخ کے ذریعہ ان تصورات کو جو عملی شکل میں وجود میں آتے ہیں بہتر طریقہ سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فلسفہ اور فکر کس طرح تاریخ سے اپنا رشتہ اور تعلق ملاتے ہیں۔ فیصلہ کا موضوع فرد ہوتا ہے لیکن اس کا دائرہ آفاقی ہوتا ہے۔ لہٰذا تاریخ فرد کو جانچتی ہے۔ لیکن اسی میں آفاقیت ہے۔

فلسفہ تصورات اور افکار تخلیق کرتا ہے۔ تاریخ اسے عملی شکل دیتی ہے اس لئے تصورات و افکار کی عملی شکل میں حقیقت پوشیدہ ہے تمام تاریخ حقیقت ہے اور تمام علوم تاریخی علوم ہیں۔ علم فلسفہ تاریخ کا ایک جزو ہے۔ یہ وہ آفاقی عنصر ہے جس کی مخصوص شکل فرد ہے اور فرد

کے عمل کا بیان تاریخ ہے۔ تاریخ ایک محدود علم کا نام نہیں، بلکہ یہ وہ علم ہے جو وسیع و عریض موضوع کو سمیٹ کر تمام علوم کی حقیقتوں کو بیان کرتا ہے۔

کروچے کے نزدیک تاریخ ان واقعات کا علم ہے جو وقوع پذیر ہو چکے ہیں جن کی حقیقت ٹھوس اور انفرادی ہے۔ اس انفرادی حقیقت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں جذب ہوا جائے، اس کی گہرائیوں میں اترا جائے اور اس کی روح کو سمجھا جائے۔ اس کی زندگی کو اپنی زندگی بنایا جائے اور پھر اس کا تجزیہ کیا جائے۔ کسی شے میں خود کو جذب کرنے سے تاریخی واقعہ کی حقیقت بہتر طریقہ سے واضح ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: "اگر تم نیو لیتھک، لیگورین، اور سسلین کی تاریخ کو سمجھنا چاہتے ہو تو کوشش کرو کہ تم ذہنی طور پر نیو لیتھک، لیگورین اور سسلین بن جاؤ، اگر تم ایسا نہیں کرنا چاہتے یا ایسا نہیں کر سکتے تو پھر اسی پر مطمئن ہو جاؤ کہ ان کی قدیم اور شکستہ کھوپڑیوں اور تصویروں سے دل بہلاؤ جو تمہیں مل گئی ہیں۔ اگر تم گھاس کے گھٹے کی صحیح تاریخ جاننا چاہتے ہو تو گھاس کا گھٹا بن جاؤ، اگر تم ایسا نہیں کر سکتے پھر اس کے تنکوں کے تجزیہ اور ان کی خوبصورتی پر مطمئن ہو جاؤ۔"

کروچے تاریخ میں حقیقت کی تلاش اسی وقت ممکن قرار دیتا ہے جب ذہنی و شعوری طور پر خود کو اس ماحول اور حالات میں جذب کر دیا جائے صرف اسی صورت میں ہم حقیقت کی تہہ اور گہرائی تک پہونچ سکتے ہیں ورنہ محض قدیم اشیاء کو دیکھنے، اور نوادرات سے لطف اٹھانے سے اس دور کی روح اور حقیقت کو نہیں سمجھا جا سکتا۔

کروچے فلسفہ اور تاریخ کو یک جان و دو قالب قرار دیتا ہے۔ جہاں تک

سائنس کا تعلق ہے، تاریخ سائنس سے پہلے وجود میں آئی، کیونکہ سائنس کی بنیاد جن واقعات، تجربات، شہادتوں اور مواد پر ہے وہ تاریخی مواد ہے۔ اس لئے جب تک تاریخ واقعات کا تعین نہیں کرتی اس وقت تک سائنسدان بھی کچھ نہیں کر سکتا۔

گرچہ تاریخ کا موضوع اس ماضی کو بناتا ہے جس کی شہادتیں اور واقعات موجود ہیں۔ وہ ماضی نہیں جو واقعات اور شہادتوں سے محروم ہو۔ ماضی کا ایک حصہ گمنامی و اندھیرے میں روپوش ہے اور ہمارے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں رہا کہ جس سے ہم ان واقعات کی کھوج لگائیں۔ انھیں اندھیرے سے اجالے میں لائیں اور واقعات کی مدد سے ماضی کی تعمیر کریں۔ ہم صرف شہادت کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ یونان میں عظیم مصور تھے، لیکن محض شہادت پر ایک بات کو بیان کرنے سے یہ بات پایۂ ثبوت تک نہیں پہونچتی۔ کیونکہ ہمارے سامنے ان مصوروں کی کوئی تصویر نہیں۔ اس کے برعکس جب یہی بات یونان کے سنگتراشوں کے بارے میں کہی جاتی ہے تو یہ تاریخی علم ہوتا ہے، کیونکہ ان کے تراشیدہ مجسمے آج بھی ہمارے جمالیاتی ذوق کی نشوونما اور ترقی میں حصہ لے رہے ہیں اور ہماری موجودہ زندگی کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔ یونانی مجسمہ سازی کی تاریخ ہمارے موجودہ جمالیاتی تجربہ کا ذریعہ بن گئی ہے۔ اس سے تاریخ اور روزنامچہ میں فرق واضح ہوتا ہے جن مصوروں کے نام ہمارے پاس روایتی طور پر چلے آرہے ہیں وہ یونانی مصوری کی تاریخ نہیں بناتے بلکہ وہ یونانی مصوری کے روزنامچہ ہیں۔ روزنامچہ اس لئے کہ وہ، وہ ماضی تعمیر کرتے ہیں جس پر صرف شہادتوں یا روایتوں کی بنا پر یقین کیا جاتا ہے اس لئے یہ تاریخ

نہیں ہوتی ۔ اس لئے ہر وہ تاریخ روزنامچہ بن جاتی ہے جب بیان کرنے والا اس کے کرداروں کے تجربات کو نظر انداز کر دیتا ہے ۔ اس لئے روزنامچہ سے پہلے ضروری ہے کہ تاریخ کا وجود ہو، کیونکہ روزنامچہ تاریخ کا جسم ہے اور جب اس میں سے روح نکل جاتی ہے تو وہ تاریخ کا مردہ جسم بن جاتا ہے ۔ کروچے کہتا ہے کہ تاریخ میں کسی شہادت کی ضرورت نہیں، کیونکہ شہادت روزنامچہ کے لئے ضروری ہے جو لوگ شہادت، تصدیق اور انحصار کی بات کرتے ہیں وہ تاریخ کی نہیں بلکہ روزنامچہ کی بات کرتے ہیں ۔

تاریخ دو چیزوں کے ملاپ سے تشکیل پاتی ہے: ثبوت اور تنقید، ماضی اپنے پیچھے نشانیاں چھوڑ جاتی ہے، یہ نشانیاں محض بے حس ٹکڑے نہیں ہوتے، ان میں ماضی کے افکار اور ماضی کی فکر چھپی ہوئی ہوتی ہے، یہ ماضی کے ذہن و شعور کی عکاسی کرتے ہیں اور ہم ان نشانیوں کو اس لئے محفوظ رکھتے ہیں تاکہ یہ مستقبل کے مورخ کے لئے ثبوت کے طور پر فراہم ہوں ۔ ماضی کی ان نشانیوں کو جو میوزیم میں موجود ہیں یا جنہیں آثارِ قدیمہ کے تحت محفوظ کر لیا گیا ہے، صرف ان نشانات اور نوادرات کی تفصیل بیان کرنا، ان کی رنگ، ہیئت اور ساخت کا نقشہ کھینچنا نام نہاد تاریخ ہے، کیونکہ ایسی تاریخ میں صرف بیان ہوتا ہے کوئی تنقید اور تاویل نہیں ہوتی، اس لئے یہ بیان تاریخ کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا ۔ اسی طرح جو تاریخ جذبات و خواہشات اور تعصب کی بنیاد پر لکھی جائے وہ بھی ایک نام نہاد تاریخ ہوتی ہے اس کو شاعرانہ یا رومانوی تاریخ تو کہہ سکتے ہیں، کیونکہ اس کا

مقصد یہ نہیں ہوتا کہ حقیقت کو آشکار کیا جائے بلکہ یہ مقصد ہوتا ہے کہ حقیقت کو اپنے رنگ میں رنگا جائے، اس قسم کی تاریخ مصنف کی خواہشات و جذبات کو ماضی کے بارے میں ظاہر کرتی ہے، اس میں حقیقت کو پانے کی کوئی جستجو نہیں ہوتی، اس لئے جو تاریخ جذبۂ حب الوطنی - قومی - انسانی آزادی اور مذہبی و نظریاتی نقطۂ نظر سے لکھی جائے اس میں تعریف اور نفرت انتہا پر ہوتی ہے۔ ایسی تاریخ، تاریخ کہلانے کی مستحق نہیں، کیونکہ جذبات اور تعصبات اسے ثبوت، شہادت اور صداقت سے دور لے جاتے ہیں۔ اس لئے صحیح تاریخ صرف وہ ہوتی ہے جس میں ثبوت اور شہادت پر نظر رکھی جائے اور ذاتی خواہشات کو نظر انداز کر دیا جائے۔

اٹھیسویں صدی کے مشہور مورخ تین (Tain) کا کہنا ہے کہ:

"پہلے واقعات کو جمع کرو، پھر ان کی وجوہات تلاش کرو"۔ کروچے اس پر بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ واقعات ٹھوس اور واضح حقائق سے بھرے ہوتے ہیں، لیکن ان میں سائنس جیسی ترتیب اور تنظیم نہیں ہوتی، یہ ترتیب اسی وقت ہو سکتی ہے جب ان کی "وجہ" دریافت کی جائے۔ اسباب و علل ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ سے ملاتے رہتے ہیں اور لامتناہی واقعات کا سلسلہ چلتا رہتا ہے واقعات کی زنجیر برابر بڑھتی رہتی ہے، لیکن ہم اس وجہ یا وجوہات کو نہیں پا سکتے جس سے اس زنجیر کی ابتداء ہوئی ہے اور جس بنیاد پر واقعات کی عمارت تعمیر ہوئی ہے۔

اس لئے کروچے اس بات پر یقین نہیں کرتا کہ تاریخ کسی ایک خاص متعین منصوبہ پر عمل کرتی ہے یا کسی خاص مقصد کی تکمیل کرتی ہے

کیونکہ کسی ایک متعین راستہ پر چلنا فطرت کا طریقہ ہے، تاریخ کہانیں، تاریخی واقعات سے جو انسانی ذہن کے رجحانات، افکار و خیالات، مقاصد اور دلچسپی کی عکاسی کرتے ہیں، ظاہر نہیں ہوتا کہ انسان کسی منصوبہ کی تکمیل کر رہا ہے یا کسی مقصد کے تحت نپے تلے راستہ پر چلا جا رہا ہے۔ بلکہ یہ واقعات الجھن اور پیچیدگی پیدا کر کے انسان کو اندھیرے اور تاریکی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتے ہیں۔

ٹائن بی

آرنلڈ جوزف ٹائن بی ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوا۔ اعلیٰ تعلیم آکسفورڈ میں حاصل کی، پھر اسی یونیورسٹی میں ۱۹۱۵ء تک پڑھایا۔ اس کے بعد لندن یونیورسٹی میں بازنطینی اور جدید یونانی زبان و ادب اور تاریخ کا پروفیسر رہا۔ ۱۹۲۵ء سے ریٹائر ہونے تک رائل انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیرز کا ڈائرکٹر رہا۔ ۱۹۷۶ء میں اس کی وفات ہوئی۔ ٹائن بی کی تصانیف کی تعداد کافی ہے، لیکن اس کی مشہور کتاب "مطالعۂ تاریخ" ہے۔

مطالعۂ تاریخ میں ٹائن بی نے ۲۶ تمدنوں کے عروج و زوال کی تاریخ لکھی ہے ان میں وہ تمدن بھی ہیں جو ایک محدود مدت کے لیے وجود میں آئے اور پھر گم ہو گئے۔ وہ بھی ہیں جنھوں نے انتہائی عظمت اور شان و شوکت

اختیار کی۔ اس نے ان ۲۶ تمدنوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ بالکل ابتدائی تمدن

۲۔ پرائمری تمدن، جن میں مصری، سمیری، اور انڈک (ہندوستانی) ہیں

۳۔ ثانوی تمدن، جن میں بابلی، ہندوستانی، شامی، یونانی اور چینی (شنگ زمانے کے) ہیں

۴۔ اعلیٰ تمدن، جن میں یہودیت، مجوسیت، ہندومت، اسلام اور عیسائیت شامل ہیں۔ یہ تمدن سابقہ تمدنوں سے متاثر ہوئے ہیں جیسے مجوسیت بابل سے، ہندومت انڈک سے، اسلام شامی سے اور عیسائیت یونانی تمدن سے۔

تمدن کیوں کر پیدا ہوتے ہیں؟ اور یہ کیوں کر ترقی کرتے ہیں؟ اس کا جواب دیتے ہوئے ٹائن بی کہتا ہے کہ تمدن کی پیدائش یا ارتقاء کسی نسل کی برتری یا حالات کے سازگار ہونے پر نہیں۔ بلکہ تمدن سخت ماحول میں پیدا ہوتے ہیں اور یہ سخت ماحول انسان کو چیلنج دیتے ہیں اور انسان اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے ان کا جواب دیتا ہے۔ اس لئے یہ چیلنج ہمیشہ اندرونی طاقت اور نئی تخلیق کو پیدا کرتے ہیں۔ مصری، سمیری، اور بابلی تمدنوں کی پیدائش انہیں سخت حالات میں ہوئی۔ انسان نے ارضی و سماوی آفات کا مقابلہ کیا۔ فطرت سے جنگ لڑی اور اس فتح کے نتیجہ میں تمدن وجود میں آیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ تمدن نے ہمیشہ سخت حالات میں جنم لیا۔ اس لئے چین کا تمدن یانگ سی کی وادی میں پیدا نہیں ہوا، جو زرخیز اور خوشگوار تھی، بلکہ دریائے زرد کے کنارے پیدا ہوا جو سیلابی اور دلدلی علاقہ تھا۔

ٹائن بی کے نزدیک تمدن کا ارتقاء حیاتیاتی عمل نہیں کہ اس کی پیدائش

ے بعد اس کی نشو و نما بھی ہو گی۔ تمدن کی بالیدگی اور ترقی کے لئے ضروری ہے کہ تمام چیلنجوں کا بھرپور جواب دیا جائے، کیونکہ جو تمدن چیلنج کا جواب نہ دے سکے وہ ختم ہو گئے۔ اگر چیلنج سخت ہوا، اور اس کے جواب میں معاشرے نے اپنی تمام قوت خرچ کر دی، تو اس میں اتنی قوت و طاقت ہی نہیں رہا کہ وہ ترقی کر سکے۔ لہذا:

۱۔ تاریخ میں کچھ ایسے معاشرے گزرے ہیں جنھوں نے بالکل ترقی نہیں کی اور اسی حالت میں فنا ہو گئے جس میں انھوں نے جنم لیا تھا۔

۲۔ کچھ ایسے معاشرے بھی تھے، جنھوں نے فطرت کے مقابلہ میں ہتھیار ڈال دیئے اور پھر خانہ بدوشی کی زندگی اختیار کر لی۔

۳۔ کچھ ایسے تمدن تھے جنھوں نے چیلنج کا موثر جواب دیا اور اس صورت میں انہوں نے انتہائی ترقی کی۔

اس سے ثابت ہوا کہ فطرت کی بے پناہ سختیاں آدمی کی جد و جہد کو ختم کر دیتی ہیں، اور معاشرہ ان سختیوں کے مقابلہ میں اپنی تمام طاقت [illegible] اپنے وجود کو برقرار رکھنے میں صرف کر دیتا ہے۔ اس کی مثال شمالی عرب کا معاشرہ اور مشرقی جزائر میں پولی نیشین تمدن ہے، جو ترقی نہیں کر سکے اور اپنے ابتدائی دور ہی میں رہے۔

معاشرہ کی ترقی کی نشانی سیاسی وسعت، یا اعلیٰ فنی کارکردگی نہیں ہوتیں، سیاسی وسعت تمدن کے دورِ انتشار میں ہوتی ہے۔ اگر تمدن کے نشوونما کے دور میں فنی ترقی ہو تو یہ اس کے لئے موت کا باعث ہوتا ہے۔ جیسا کہ گھرے ہوئے تمدن (Arrested Civilization) میں ہوا۔ فنی تخلیق نے ان کی تمام صلاحیتوں کو ختم کر دیا اور معاشرہ اس کا غلام بن کر رہ گیا۔

تمدن کے ارتقاء کے لئے لطافت کا عمل یعنی سادگی لباس، زبان، سائنس اور تکنیک ضروری ہے، کیونکہ اس میں کم طاقت صرف ہوتی ہے اور مادی وسائل کے کم استعمال سے روحانی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس مرحلہ پر سماجی و روحانی چیلنج زیادہ ہوتے ہیں اور مادی کم۔ ان چیلنجوں کے جواب کے بعد ارتقاء کا عمل معاشرہ کو خود ارادیت اور خودمختاری کا جذبہ دیتا ہے اور معاشرہ روحانیت کی جانب ارتقاء کرتا ہے مثلاً: یونانی تمدن نے جمالیات کی جانب، ہندوستانی تمدن نے مذہب کی جانب اور مغربی تمدن نے سائنس کی جانب توجہ دی اور ترقی کی۔

تمدن کی ترقی میں تخلیقی افراد اور تخلیقی اقلیت زبردست حصہ لیتی ہے تخلیقی افراد وہ ہیں جنھیں انسانِ کامل، علوی انسان یا عبقری کہا جاتا ہے۔ یہ معاشرے کی راہنمائی سے پہلے گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں اور اس گوشہ نشینی کے دوران مسلسل عبادت اور ریاضت سے روحانی اور مادی طور پر اپنی شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں۔ جب ان کی شخصیت مکمل ہو جاتی ہے تو پھر یہ معاشرے میں واپس آتے ہیں۔ یہ عمل ٹائن بی کے ہاں "گوشہ نشینی اور واپسی" کے نام سے ہے۔ جب یہ اپنا پیغام معاشرے کے سامنے پیش کرتے ہیں تو ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر معاشرے کی ذہین اقلیت ان کا ساتھ دیتی ہے۔ یہ تخلیقی اقلیت معاشرے میں ذہنی انقلاب لاتی ہے۔ لیکن یہ گوشہ نشینی اور واپسی صرف شخصیتوں تک محدود نہیں بلکہ تمدن بھی اس عمل سے گذرتے ہیں، یونانی تمدن میں ایتھنز کی مثال ہے جس نے ۸ اور ۶ صدی ق-م- میں نوآبادیات پر قبضہ

کرنے میں حصّہ نہیں لیا، اور یونان کی تمام سرگرمیوں، مہمات اور فتوحات سے اپنے کو علیحدہ رکھا۔ اس کے بعد ایتھنز اپنی یکجا قوتوں کے ساتھ میدان میں آیا اور پورے یونان کی راہنمائی کی۔ یورپی تمدن میں ۱۳ ویں اور ۱۵ ویں صدی میں اٹلی یورپ کے ہنگاموں سے دور رہا اور پھر تجارتی و صنعتی ملک بن کر ابھرا۔ یہی حال برطانیہ کا تھا جو ۱۵ ویں سے ۱۸ ویں صدی تک یورپ سے دور رہا، اور اس دوران اس نے پارلیمانی جمہوریت کی پرورش کی اور معاشرے کو صنعتی بنیادوں پر استوار کیا۔ ٹائن بی کے نزدیک روس کی یورپ سے علیحدگی بھی اسی عمل کے تحت ہے۔ جب اس کی ریاضت ختم ہوگی تو اس صورت میں وہ پھر واپس آکر یورپ کی راہنمائی میں بڑا حصّہ لے گا، کیونکہ اس گوشہ نشینی کے دوران یہ اپنے معاشرے کو پاک و صاف کرے گا، اپنی قوتوں کو اکٹھا کرے گا اور نئی زندگی و جذبے سے میدان میں آئے گا۔

ٹائن بی کے نزدیک تخلیقی اقلیت تمدن کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہے اور معاشرے کی اکثریت ان کی تقلید کرتی ہے۔ معاشرے میں ترتیب و تنظیم، ان کی قوتوں کا استعمال اسی تخلیقی اقلیت کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ ٹائن بی تمدن کے اس دور کی ایک اہم بات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب ترقی یافتہ معاشرہ یا تمدن بے جان ہونے لگتا ہے اور اس میں تعطل آنے لگتا ہے یا زندگی کی حرارت اور شدت کم ہو جاتی ہے تو اس وقت خارجی جھٹکے اسے پھر سے جھنجھوڑ دیتے ہیں اور اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر سستی و کاہلی و بے حسی سے بیدار کرتے ہیں مثلاً جب تیمور نے بایزید کو شکست دی تو اس صدمہ نے عثمانیوں میں مایوسی و ناامیدی کے بجائے ایک نیا جوش

و ولولہ پیدا کیا، اور ان میں یہ احساس پیدا ہوا کہ اپنی کمزوری کو ختم کر کے شکست کے بدنما داغ کو مٹائیں، چنانچہ سلطان محمد فاتح کے زمانہ میں عثمانیوں نے ایک بار پھر اپنی طاقت کو مستحکم کیا۔ اس کی دوسری مثال اہل کار تھیج کی ہے، جب انھوں نے پیونک جنگوں میں شکست کھائی تو اس نے پوری قوم کو بیدار کر دیا اور نیئے جذبہ کے ساتھ ھنکار کی سربراہی میں اسپین کو فتح کر لیا۔ اس کی تیسری مثال آسٹریا اور پرشیا کی ہے۔ جب نپولین نے ان ملکوں کو فتح کیا تو انھیں اپنی سیاسی و فوجی کمزوریوں کا احساس ہوا، اور ان کے ہاں مختلف تحریکیں اٹھیں جنھوں نے آسٹریا اور پرشیا میں ذہنی و شعوری بیداری پیدا کی۔

اس طرح بعض معاشرے خارجی دباؤ اور خارجی خطرہ کا مقابلہ کرتے ہوئے ترقی کرتے ہیں: مثلاً جب عثمانی ترک اناطولیہ میں آئے تو انھیں بلقان کی جانب سے حملہ کا خطرہ تھا، اس حملہ کے خطرہ نے انھیں اس قدر متحرک اور جاندار رکھا کہ انھوں نے خود آگے بڑھ کر مشرقی یورپ پر قبضہ کر لیا، لیکن جو ترک وسط ایشیا میں آباد تھے چونکہ انھیں کوئی خارجی خطرہ نہ تھا اس لئے وہ اسی طرح رہے اور کوئی ترقی نہیں کر سکے۔

ٹائن بی تمدن کی ترقی کے بعد اس درجہ پر آتا ہے جس میں تمدن ٹوٹ جاتا ہے اور ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی صورت میں اس کی ترقی رک جاتی ہے تمدن کیوں کر ٹوٹتا ہے اور اس کی ترقی کیوں رک جاتی ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ جب تخلیقی شخصیت اور تخلیقی اقلیت غلطی پر غلطی کرتی ہے اور چیلنج کا جواب نہیں دیتی اور خاموشی اختیار کر لیتی

ہے۔ جب تخلیقی اقلیت میں فخر و غرور کے احساسات پیدا ہو جاتے ہیں، حکومت و اقتدار کی ہوس انھیں اندھا کر دیتی ہے اور طاقت و ظلم کے ذریعے اپنے احکام منواتے ہیں تو ان کی ذہانت تعمیر کے بجائے تخریبی سرگرمیوں میں صرف ہونے لگتی ہے۔ عوام پرانی اقدار اور پرانے اداروں کی اندھی تقلید کرنے لگتے ہیں اور شخصیت پرستی پر زور دیا جانے لگتا ہے۔ اس مرحلہ پر عوام کے ایک حصّہ کا تخلیقی اقلیت پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور وہ اس سے بغاوت کا اعلان کر دیتے ہیں یہ طبقہ داخلی پرولتاریوں کا ہوتا ہے جو حالات سے مطمئن نہیں ہوتے اور اس میں تبدیلی چاہتے ہیں۔

کیا کوئی تمدن اس مرحلہ پر پہونچنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے ہونے اور فنا ہونے سے بچ سکتا ہے؟ یا اس کی تقدیر میں موت لکھی ہوئی ہے۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ٹائن بی کہتا ہے کہ اگر فرقہ بندی اور اختلافات ختم کر کے اتفاق و اتحاد پیدا کیا جائے تو اس صورت میں زوال کا عمل رک سکتا ہے اور تمدن اپنی جگہ پتھر کی طرح جامد ہو کر صدیوں اسی حالت میں قائم رہ سکے گا۔ تمدن کے ایک جگہ جم جانے اور ٹھہرنے کو ٹائن بی (Petrifaction) کہتا ہے، لیکن اگر ایسا نہیں ہوا تو پھر زوال کو روکنا ناممکن ہوتا ہے۔

جب تمدن ٹوٹنے اور ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے بعد زوال کے آخری اسٹیج پر آتا ہے تو اس کی کئی وجوہات ہوتی ہیں: سب سے پہلے اندرونی پرولتاری معاشرے کے استحکام کو ختم کر کے اس میں نااتفاقی پیدا کر دیتے ہیں اس کے بعد زوال پذیر معاشرے سے اور تمدن سے وہ بھی بغاوت کرتے ہیں جو معاشرے میں نہیں ہوتے لیکن تمدن کے اثر سے جکڑے

ہوتے ہیں (ان کی اپنی کوئی اعلیٰ و ارفع تہذیب یا تمدن نہیں ہوتا)
زوال کے دوران ان پر سے تمدن کے سحر اور افسوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے
اور وہ بھی اس سے بغاوت کر کے اس کی تباہی کے در پے ہو جاتے ہیں
یہ طبقہ "خارجی پرولتاریوں" کا ہوتا ہے۔

زوال پذیر تمدن سے روحانی اقدار بھی ختم ہو جاتی ہیں اور ان کی زندگی
سے حرارت و گرمی نسیست و نابود ہو جاتی ہے۔ اس وقت معاشرے
کے سامنے تین راستے ہوتے ہیں!

۱۔ قدامت پرستی اختیار کریں اور پرانے مذہب، آرٹ، فن، زبان
اور پرانی اقدار کو اسی طرح برقرار رکھنے دیں اور کسی تبدیلی و تغیر
کو قبول نہ کریں۔

۲۔ یا تمام قدیم روایات اور اقدار کو ترک کر دیں۔ نئے مسائل اور
چیلنج کا موثر جواب دیں اور نئے تجربوں کے ساتھ سیاست، معیشت
اور آرٹ میں تبدیلی کریں۔

۳۔ اور یا راہِ فرار اختیار کریں، مایوس و ناامید ہو کر جد و جہد
ترک کر دیں اور سکون و اطمینان سے موت کا انتظار کریں۔

اس موقع پر ایک طبقہ ایسا بھی ہوتا ہے جو خوش فہمی میں پناہ لیتا ہے
اور اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ ہم خدا کی پسندیدہ مخلوق ہیں اور
ہمارا زوال ہمارے گناہوں کی سزا ہے، لیکن مستقبل میں خدا ہماری
حالت بدلے گا اور تباہی و بربادی سے بچائے گا۔

زوال پذیر تمدن مصیبتوں اور کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے جس میں مسلسل
سیاسی و سماجی اور معاشرتی تصادم رہتا ہے۔ ریاستوں میں آپس
میں خوں ریز جنگیں ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کو تباہ کرنے کی کوشش

کی جاتی ہے۔ آخرکار ان میں سے ایک طاقت کامیاب ہوتی ہے تو اس وقت عوام کی دو خواہشیں ہوتی ہیں: امن و امان اور جان مال کا تحفظ۔ ان خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ایک مضبوط عالمی ریاست قایم ہوتی ہے جس میں اقتدار اقلیت کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور یہ اقلیت ناراض و باغی داخلی و خارجی پرولتاریوں پر طاقت و قوت سے حکومت کرتی ہے۔ درحقیقت عالمی ریاست کا قیام داخلی و خارجی پرولتاریوں کے جواب میں ہوتا ہے جو اقلیت کے ہاتھوں پورا ہوتا ہے۔ لیکن پرولتاری اس ریاست کی تشکیل سے مطمئن نہیں ہوتے اس لئے وہ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے نئے نظریات اور نئے مذاہب کو فروغ دیتے ہیں، اس طرح سے پرولتاری، بااقتدار اقلیت کو چیلنج کرکے عالمی چرچ قایم کرتے ہیں اس کے بعد عالمی ریاست کو نیست و نابود کرنے کی خاطر داخلی و خارجی پرولتاری جنگجو دستے قایم کرتے ہیں جو کسی مہم جو شخصیت کی رہنمائی میں عالمی ریاست کی سرحدوں پر حملہ کرتے ہیں، آخر عالمی ریاست اور بااقتدار اقلیت ان جنگجو دستوں کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ کیونکہ عالمی ریاست ان کا جواب نہیں دے سکتی، اس لئے تمدن موت کی آغوش میں روپوش ہو جاتا ہے۔

تمدن کی اس موت کے بعد معاشرہ پھر سے قدیم طریقۂ زندگی کو اختیار کرلیتا ہے، یہاں تک کہ ایک نیا تمدن ابھرتا ہے، یہ دور "درمیانی زمانہ" کہلاتا ہے، جو دو تمدنوں کے درمیان کا ہوتا ہے، ایک مردہ اور دوسرا آنے والا۔ اس دوران میں غیر مہذب قبائلی آزادانہ زندگی گزارتے ہیں۔ جنگجو سردار ان پر حکومت کرتے ہیں۔ بہت سے تمدن اس درمیانی درجہ میں فنا ہو جاتے ہیں، لیکن پرانے تمدن کی خاکستر سے

ایک نیا تمدن ابھرتا ہے۔

تمدن کی پیدائش یا ابتداء، ترقی، اس کا ٹوٹ جانا، اور پھر ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا، اس تجزیہ کے بعد ٹائن بی مغربی تمدن کا جائزہ لیتا ہے کہ یہ کس دور میں ہے اور کیا اس کا زوال شروع ہو چکا ہے؟ ٹائن بی مغربی تمدن کو زوال پذیر ہوتے دیکھ رہا ہے: اندرونی تفرقات، اقلیت کا غلبہ، داخلی و خارجی پرولتاریوں کی بے چینی، مذہب کا زوال، سماجی اقدار کا خاتمہ، یہ وہ مسائل اور مشکلات ہیں جن سے مغربی تمدن برسرِ پیکار ہے۔ صنعتی و مادی ترقی نے روحانی اقدار کو مٹا دیا ہے، جمہوریت نے ثقافت، آرٹ، فن، اور سیاست کو عوامی بنا کر اس بلندی اور گہرائی کو ختم کر دیا ہے اور اس میں سطحیت پیدا کر دی ہے، کمیونزم نے مزید مغربی تمدن کی مضبوط عمارت میں شگاف ڈال دئے ہیں۔

تو کیا اس صورتِ حال میں مغربی تمدن بھی دوسرے تمدنوں کی طرح ختم ہو جائے گا؟ کیا اس کی تقدیر میں بھی فنا حتمی ہے؟ ٹائن بی اس اہم سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ کسی تمدن کی تقدیر اٹل اور فیصلہ کن نہیں ہوتی، اس لئے یہ ہماری طاقت اور اختیار میں ہے کہ ہم مغربی تمدن کو بچا سکیں، اس کے تحفظ کی صورت یہ ہے کہ مغربی تمدن کو آفاقی تمدن بنا دیا جائے اور اسے انسانیت کی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ لہٰذا اس صورت میں وہ سب کچھ اختیار کر لیا جائے جو دوسرے تمدنوں میں بہتر اور تعمیری ہے۔ ہمیں چاہئیے کہ سقراط، افلاطون، زرتشت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم، پیغمبر، پال، اور ابن خلدون وغیرہ ان سب کو ایک جگہ جمع کر کے ہم آہنگی پیدا کریں۔

اس صورت میں یہ آفاقی تمدن پوری انسانیت کو اپنے دامن میں پناہ دے گا۔ ٹائن بی مستقبل سے بڑا پرامید ہے۔ اس کا یقین ہے کہ اگر آفاقی تمدن کے ذریعے عالمی حکومت قایم کی جائے اور دنیا کے چار عظیم مذاہب اور ان کی خصوصیات کو یکجا کر دیا جائے تو اس صورت میں انسانیت تباہی سے بچ سکتی ہے۔ اس لئے ہندو مت کی فکر، عیسائیت کی جذباتیت (Feelings) اسلام کی حساسیت (Sensations) اور بدھ مت کی وجدانیت کو ملاکر عالمی معاشرے کی تشکیل کی جائے۔

ٹائن بی کے نزدیک یہ انسانیت کے تحفظ اور بقا کی امید ہے۔

وِل ڈیورانٹ

وِل ڈیورانٹ نے اعلیٰ تعلیم کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک میں حاصل کی۔ کچھ عرصہ صحافت کا پیشہ اختیار کیا، پھر درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا اور فلسفہ پڑھاتا رہا۔ ۱۹۲۷ء میں اس نے ملازمت ترک کر دی اور "تمدن کی کہانی" لکھنی شروع کی، جو ۱۱ جلدوں میں ختم کی۔ آخر میں اس نے تاریخ کے مطالعہ کا نچوڑ "Lessons of History" (تاریخ کے اسباق) میں لکھا۔

وِل ڈیورانٹ کی "تمدن کی کہانی" "ہماری مشرقی میراث" سے شروع ہو کر "عہدِ نپولین" تک گیارہ ضخیم جلدوں میں ختم ہوتی ہے۔ یہ انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء اور ترقی کی ایک دل فریب متحرک تصویر ہے۔ چار ہزار سال کی طویل مدت میں انسان نے جن پیچ در پیچ راستوں سے سفر کیا،

جن کٹھن مقامات سے کاروانِ تہذیب کو گذرا، اور جن مصیبتوں اور تکلیفوں کو برداشت کر کے ذہن و شعور کو جلا بخشی، انسان کی یہ کہانی ان ہزارہا صفحات پر بکھری ہوئی ہے، اور یہ انسان ہر رنگ، روپ اور حلیہ میں متحرک و باعمل نظر آتا ہے۔ سخاوت و فیاضی، شرافت و نیکی کے مجسمے، تنگ نظری، بخل و عیاری کے نمونے، جرأت و بہادری اور شجاعت کے متوالے، تو بزدلی و مکاری اور دھوکے بازی کے رسیا، ایسا انسان ہر زاویے اور ہر پہلو سے اس میں جلوہ گر ہے۔ یہاں شاعر، ادیب، فلسفی، مورخ، سنگتراش، مصور، موسیقار اور مغنی ہیں تو ان کے ساتھ تلوار لئے جیالے سپاہی، جنرل اور مطلق العنان بادشاہ اور ان کے خوشامدی امرا و بھی ہیں۔ یہ ایک طویل کہانی ہے۔ انسانی تہذیب کے عروج و زوال، ارتقاء و ترقی، نشوونما اور موت کی، جس کی ابتداء ضرور ہے لیکن انتہا کوئی نہیں۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جس کا انجام کوئی نہیں۔ انسان کی یہ کہانی بڑی سبق آموز ہے کیونکہ یہ انسانی تہذیب و تمدن کے مختلف پہلوؤں اور ان کے تجربات و مشاہدات کا ذخیرہ لئے ہوئے ہے۔ کیا تاریخ کا یہ طویل سلسلہ انسان کے مستقبل کے لئے افادیت کا حامل ہو سکتا ہے؟ کیا تاریخ کے مطالعہ کے بعد انسان ماضی کے تجربات سے فائدہ اٹھا سکتا ہے؟ کیا تاریخ آج کے سائنسی دور میں انسان کی منزل متعین کر سکتی ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب ول ڈیورانٹ نے "تاریخ کے اسباق" میں دیا ہے۔

ول ڈیورانٹ تاریخ اور ارضیات کے باہمی رشتہ کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب تاریخ اور ارضیات کے باہمی تعلق اور رفتار کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دریا، پہاڑ، سمندر،

صحرا، ریگستان اور نخلستان کے درمیان الجھتا ہوا انسان مسلسل جدوجہد اور سعی پیہم میں نظر آتا ہے۔ اس جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین کی گہرائیوں اور فطرت کے راز اس کے لئے کوئی راز نہیں رہے۔ اس نے زمین کے چپہ چپہ کو مسخر کر لیا: وہ زمین کے سینے کو چیرتا ہے، غلہ اگاتا ہے، زمین کی گہرائیوں میں جاتا ہے، معدنیات کے ذخیروں کو دریافت کرتا ہے، تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ زمین کا مالک و مختار ہے۔ لیکن دوسری جانب انسان اپنی تمام صلاحیتوں، قوتوں اور ذہانت کے باوجود فطرت کے مقابلہ میں کمزور و بے کس نظر آتا ہے، اس کی صدیوں کی محنت و مشقت سے تعمیر شدہ خوبصورت شہر، خوبصورت عمارتیں، وسیع و عریض و بلند و بالا محلات آنِ واحد میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین کے برابر ہو جاتے ہیں اور انسان کا فخر و غرور، اور اس کی کاری گری سب خاک میں مل جاتی ہیں۔ انسان فطرت کے مقابلہ میں ناکام ہوا ہے۔ فطرت اپنی رحمتوں سے اور اپنی بلاؤں سے انسان کو مسرور و ہراساں رکھتی ہے۔ آج بھی انسان کی جسمانی و ذہنی ساخت کا دارومدار فطرت کے حالات پر ہے۔ اگر کسی علاقہ میں بارش کم ہو تو پورا علاقہ بنجر اور ریگستان ہو جاتا ہے اور اس بنجر علاقہ سے تہذیب ختم ہو جاتی ہے جیسے وسط ایشیا میں، لیکن اگر بارش زیادہ ہو تو تہذیب گھنے جنگلوں میں روپوش ہو جاتی ہے جیسے وسطی امریکہ میں۔

تاریخ اور جغرافیہ کا ربط و ضبط بڑا گہرا اور قدیم ہے، کیونکہ سمندر، دریا، چشمے، تالاب، شہر و قصبے، ذرائع آمد و رفت ان سب کا تعلق جغرافیہ سے بھی ہے اور انسان کے ذہن و جسم سے بھی۔ انسان طبعی

جغرافیہ کی حدود میں علیحدہ قوموں اور نسلوں کی شکل میں رہتا ہے
یہ پہاڑ، دریا اور سمندر اس کے علاقہ کی فطری حدیں ہیں۔ علیحدہ
علاقے میں رہنے کی وجہ سے آب وہوا اور ماحول اس کی جسمانی ساخت،
رنگ، عادات و اطوار، اور لباس کو بھی جدا کر دیتا ہے۔ لیکن رنگ
ونسل۔ لباس و عادات و عقیدہ اور زبان کے اختلاف کے باوجود
ایک انسان دوسرے انسان کا، ایک قوم دوسری قوم کی اور ایک نسل
دوسری نسل کی محتاج رہتی ہے۔ انسانی ایجادات اور علم نے ان جغرافیائی
حدوں کو ختم کردیا ہے۔ زراعت اور صنعت وحرفت نے انسان کو ایک
دوسرے سے قریب لانے میں سب سے زیادہ مدد دی ہے۔

جغرافیائی حالات کا تہذیب وتمدن کی سرگرمیوں پر بڑا اثر پڑتا ہے۔
ہر بڑے دریا کی وادی تہذیب وتمدن کا گہوارہ اور مرکز رہی ہے اور
ان دریاؤں کے کنارے انسانی آبادیاں بڑھتی اور پھیلتی قوم اور ملک
میں تبدیل ہوگئیں: جیسے نیل کے کنارے مصر، ڈینوب کے کنارے
آسٹریا، ایلبا اور رائن کے کنارے جرمنی، سین اور رہون
کے کنارے فرانس۔

جب یونانیوں نے اپنی نوآبادیاں قائم کرنے کا ارادہ کیا تو اس مقصد
کے لئے انہوں نے بحر روم کا علاقہ پسند کیا جو اپنی خوشگوار آب و
ہوا کی وجہ سے ۸۰۰ ق۔م۔ سے ۱۴۹۲ء تک مغربی اقوام کا
میدانِ جنگ رہا۔ ۱۴۹۱ء میں جب کولمبس اور واسکو ڈی گاما
نے سمندروں کو تسخیر کیا تو اٹلانٹک کا علاقہ انہی سرگرمیوں کا
مرکز بنا۔

مستقبل میں یہ جغرافیائی حالات انسان کی ترقی میں کیا حصہ لیں گے؟

اس کا جواب ول ڈیورانٹ یہ دیتا ہے کہ ایک وقت آئے گا جب انسان ہوائی سفر میں بلندی تک پہونچ جائے گا، اس وقت یہ سمندری جہاز، اور بندرگاہیں متروک ہو جائیں گی اور اس وقت وہ قومیں بھی میدانِ عمل میں آئیں گی جو اب تک قدرتی بندرگاہوں سے محروم ہیں۔ مستقبل میں قوموں کے درمیان صنعت و حرفت اور تجارت میں زبردست مقابلہ ہوگا، اور یہ مقابلہ تاریخ میں ایک عظیم انقلاب کی بنیاد رکھے گا۔

حیاتیات کا مطالعہ تاریخ کے نظریہ میں اہم اضافہ کرتا ہے، کیونکہ حیاتیات اس پر روشنی ڈالتی ہے کہ انسان کا ارتقاء کس طرح عمل میں آیا؟ اور اس ارتقاء کے دوران جدوجہد، کش مکش، تصادم، اور مقابلہ اور کے نتیجہ میں کمزور کا خاتمہ اور طاقت ور کا وجود، یہ سب کس طرح ترتیب شدہ قوانین کے تحت ہوا۔ اس مطالعہ کے بعد تاریخ کو یہ سبق ملتا ہے کہ انسانی زندگی ایک مسلسل مقابلہ کا نام ہے۔ اپنے وجود، زندگی اور بقا کے لئے زبردست اور سخت مقابلہ ضروری ہے۔ انسان کی فطرت میں خوں ریزی رچی ہوئی ہے، وہ امن صرف اس وقت قبول کرتا ہے جب غذا وافر ہو، ورنہ جس طرح ایک جانور دوسرے جانور کو بھوک کی شدت میں کھا جاتا ہے اسی طرح ایک انسان دوسرے انسان کے خون میں اپنے ہاتھ رنگتا ہے۔ انسان کی فطرت میں لالچ، خود غرضی، لوٹ کھسوٹ، اور طمع شامل ہیں۔ یہ اسے آباد اجداد سے ورثہ میں ملی ہیں، کیونکہ انسانی تاریخ کے ہر دور، اور ہر زمانہ میں انسان نے اپنے وجود کی خاطر، اپنے آرام و آسائش کی خاطر، اپنے مفاد اور فائدے کی خاطر، اپنے مقابل انسان کو حیلے اور حربے سے

ختم کیا ہے، اس کے خون سے اپنی زندگی کو تازگی اور حرارت بخشی، اس لئے جنگ وجدل، قتل و غارت گری، اور لوٹ مار کے پس منظر میں انسان کا مقصد غذا حاصل کرنا، اقتصادی خوشحالی اور معاشی برتری شامل ہیں۔ کیا انسان جنگ وجدل سے باز آ سکتا ہے؟ ول ڈیورانٹ کے نزدیک یہ جب ہی ہو سکتا ہے جب قومیں، ریاستیں اور ملک ایک دوسرے سے باہمی طور پر منسلک ہو جائیں، اپنے مفاد کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کردیں۔ اپنی ضروریات، خواہشات اور احتیاجات کو محدود کردیں، اگر ایسا نہیں ہوا، تو جنگ ہوتی رہے گی۔ انسان ایک دوسرے سے برسرِپیکار رہے گا اور خون و آگ کی ہولی کھیلی جاتی رہے گی، یہ اندوہناک سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔

حیاتیات کا دوسرا سبق یہ ہے کہ زندگی ہزارہا جدوجہد اور سعی و مشقت کے بعد وجود میں آتی ہے۔ اس لئے اس کو باقی رکھنے کے لئے بھی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ زندگی میں ہر طرف مقابلہ ہے۔ خوراک کے لئے بھی، اور طاقت کے لئے بھی۔ کچھ اس مقابلہ میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور کچھ ناکام، جو کامیاب ہوتے ہیں وہ دنیا کی نعمتوں سے فیضیاب ہوتے ہیں، جبکہ ناکام لوگوں کے لئے یہ وسیع و عریض دنیا اور اس کی نعمتیں خواب ہوتی ہیں۔ ان کا وجود اس سرزمین پر ایک بوجھ بن جاتا ہے اور وہ ہزارہا حسرتیں اور محرومیاں لئے اس دنیا سے گزر جاتے ہیں۔

کیا وجہ ہے کہ فطرت کچھ کو نعمتوں سے نوازتی ہے اور کچھ کو محروم رکھتی ہے؟ ول ڈیورانٹ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ فطرت تمام انسانوں کو مساوی طور پر ذہنی و جسمانی صلاحیتیں دے کر پیدا نہیں

کرتی ۔ ہر شخص جسمانی، ذہنی اور شعوری طور پر جدا ہوتا ہے۔ انسانوں میں یہ فرق اور امتیاز ایک فطری عمل ہے۔ ذہین افراد اپنی ذہانت اور صلاحیت سے طاقت حاصل کرتے ہیں، پھر اس طاقت سے مزید طاقت ور بنتے ہیں، جبکہ کمزور، کمزور تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ قدرت ذہانت کی تقسیم میں بہت بخیل ہے۔ ہر معاشرہ میں صرف ۲۰٪ ایسے ذہین افراد ہوتے ہیں جو معاشرے کے پورے ذہنوں کے برابر ہوتے ہیں۔

آزادی اور مساوات ساتھ مل کر نہیں رہ سکتیں، یہ ایک دوسرے کی مخالف اور دشمن ہیں۔ جب ایک آتی ہے تو دوسری چلی جاتی ہے۔ جب آدمی آزاد ہوتا ہے تو وہ معاشرے میں امتیاز اور تفریق پیدا کرتا ہے جیسے امریکہ اور برطانیہ میں ۱۹ ویں صدی میں آزاد تجارت کی پالیسی کے بعد ہوا ۔ جب معاشرے میں طبقاتی تقسیم کو روکنے کے لئے مساوات قائم کی جاتی ہے تو آزادی کو قربان کیا جاتا ہے، اس وقت ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جیسے روس میں۔ وہ لوگ جو معاشی طور پر غیر مستحکم ہوتے ہیں وہ مساوات چاہتے ہیں، اور جو ذہین ہوتے ہیں وہ آزادی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ حیاتیات کا تیسرا سبق یہ ہے کہ زندگی مسلسل تخلیق ہوتی رہتی ہے۔ فطرت اس معاملہ میں اس لئے اس قدر سخی ہے تاکہ ذی حیات جہد البقاء میں برابر شریک ہو سکیں اور اس تصادم اور کشمکش کے نتیجہ میں ذہین اور طاقت ور اشخاص الجریں فطرت ان ہی کا انتخاب کرتی ہے جو اس جدوجہد میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ کمزور، نحیف، اور ناتواں اس جنگ میں شکست خوردگی کے ساتھ موت سے ہم آغوش ہو جاتے ہیں۔

فطرت اس بات کا بھی خیال رکھتی ہے کہ غذا کا توازن برقرار رہے۔ اس لئے قحط، وبا اور جنگ آبادی کو گھٹانے میں حصّہ لیتے ہیں۔ اسی کو ذہن میں رکھتے ہوئے مالتھس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ اگر فطرت ان ذرائع سے آبادی کو کم نہیں کرتی تو پیداوار کسی بھی صورت میں بڑھتی ہوئی آبادی کا ساتھ نہیں دے سکتی اور انسانیت بحران کا شکار ہو جاتی۔ لیکن اس کے برعکس تصویر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کچھ ممالک اپنی ضرورت سے زیادہ غلّہ پیدا کرتے ہیں اور دوسرے ملکوں کو بھیجتے ہیں جہاں اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ مالتھس اس کے جواب میں کہتا ہے کہ یہ مصیبت اور غذا کے بحران کو روکنے کا ایک وقتی طریقہ ہے۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ زمین کی یہ صلاحیت کب تک باقی رہے گی۔ کیونکہ جس طرح ہر شے ایک مرحلہ پر پہونچ کر اپنی قوت و طاقت سے محروم ہو جاتی ہے، اسی طرح زمین بھی ایک وقت اپنی زرخیزی ختم کر دے گی، پیداوار گھٹے گی، غلہ کمیاب ہوگا، اور ضروریات بڑھیں گی تو اس وقت کیا ہوگا؟ کیونکہ موجودہ سائنسی ترقی نے انسانی زندگی کو طویل کر دیا ہے، شرحِ اموات میں کمی ہو گئی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اب زیادہ عمر تک زندہ رہتا ہے، اور معاشرہ میں ایسے ناکارہ افراد کی بہتات ہو گئی ہے جن کے قوائے مضمحل اور قوت مفقود ہے اور جو دواؤں کے سہارے زندگی کو طول دے رہے ہیں۔ اس لئے اس بڑھتی ہوئی آبادی کا کیا حل ہے؟ ول ڈیورانٹ اس کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ صرف برتھ کنٹرول کے ذریعے ہم افراد اور غذا میں توازن برقرار رکھ سکتے ہیں اور صرف اس طریقہ سے آبادی کو گھٹایا جا سکتا ہے اور یہی ایک طریقہ متوازن اور آئیڈیل معاشرے کے لئے ضروری ہے۔

دنیا کی تاریخ اور اس میں مختلف رنگ و نسل کے افراد و معاشروں کی جد و جہد اور اس جد و جہد کے نتیجہ میں تہذیب و تمدن کی تخلیق و ارتقاء و ترقی سے اس جذبہ کا پیدا ہونا کہ وہ دوسری قوموں سے افضل ہیں۔ ان کی تہذیب اور تمدن دوسروں سے اعلیٰ ہے۔ اس پر بحث کرتے ہوئے ول ڈیورانٹ کہتا ہے کہ اس وقت دنیا میں بیس کروڑ غیر سفید فام باشندے، اور دس کروڑ سفید فام افراد ہیں۔ دنیا کی ہر قوم خود کو اور اپنی تہذیب و تمدن کو دوسروں سے بہتر قرار دیتی ہے۔ چینیوں کے قول کے مطابق ان کی تہذیب دنیا میں سب سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ کیونکہ انہوں نے ۲ ہزار قبل مسیح سے آج تک لاتعداد سیاستدان، فلسفی، آرٹسٹ، موجد، شاعر اور سائنسدان پیدا کئے ہیں۔ میکسی کن اپنی مایا اور ایزٹک تہذیبوں پر فخر کرتے ہیں۔ ہندو اپنے معماروں، شاعروں، اور سنگ تراشوں کو سب سے اعلیٰ گردانتے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کوئی بھی ایک قوم یا اس کی تہذیب سب سے اعلیٰ نہیں۔ کیونکہ تاریخ کی نظر میں رنگ و نسل کا کوئی امتیاز نہیں، کوئی ایک نسل تہذیب کو تخلیق نہیں کرتی۔ بلکہ تہذیب نسلوں کی تعمیر کرتی ہے اور کئی نسلیں باہمی میل جول اور یگانگت سے نئی تہذیب و اقدار کو پیدا کرتی ہیں جیسے کیلٹ (Celts) رومی، انگلز (Angles) جیوٹس (Jutes)، ڈین اور نارمنوں نے مل کر انگریزی قوم کو بنایا۔ جب اس ملاپ سے قوم تشکیل پاتی ہے تو تہذیب، و تمدن میں نئے پہلوؤں کا اضافہ ہوتا ہے اور اس کے اثر سے قوم کا کردار، اخلاق، ادب، ثقافت، فن، آرٹ، اور مذہب سب کچھ بدل جاتا ہے۔

امریکی تہذیب اسی نسل و رنگ کے امتزاج اور ملاپ کے عمل سے

وجود میں آئی۔ ۱۶۰۷ء سے ۱۸۳۰ء تک شمالی فلوریڈا میں انگریز آباد تھے، اس لئے ان کی تہذیب و ثقافت انگریزی تھی، لیکن جب ۱۸۳۰ء میں یورپ کی دوسری سفید فام اقوام آئیں، تو اس نسلی خلط ملط سے ایک نئی قوم تشکیل ہونا شروع ہوئی، اس کی تکمیل صدیوں میں جا کر ہوگی اور جب یہ عمل پورا ہو جائے گا تو اس وقت امریکہ ایک نئی قوم، تہذیب، زبان، ادب اور آرٹ کا مالک ہوگا۔

قوموں میں باہمی نفرت، عداوت اور دشمنی کی وجہ نسلی امتیاز ہے۔ اس کے علاوہ زبان، لباس، عادات و اطوار، کردار، اخلاق و مذہب، اس نفرت میں اور اضافہ کرتے ہیں۔ یہ نفرت اس قدر گہری اور مضبوط ہے کہ اسے جڑ سے نکالنا ناممکن ہے، اسے صرف کم کیا جا سکتا ہے یا دبایا جا سکتا ہے اور وہ بھی صرف تعلیم کے ذریعے۔

کیا تاریخ کے اس طویل سلسلہ میں انسان کی ذہنیت بھی بدلی؟ یا اس میں کوئی انقلابی تبدیلی آئی؟ ول ڈیورانٹ اس کا جواب نفی میں دیتا ہے۔ یونانی زمانۂ قدیم میں جس رکھ رکھاؤ کے حامل تھے، آج فرانسیسی اس کی مثال ہیں۔ رومیوں کے طور طریق انگریزوں میں نظر آتے ہیں۔ تہذیب کا بنیادی مقصد اسی طرح برقرار رہتا ہے۔ اس کی گہرائی میں جو چیز چھپی ہوئی ہے وہ اسی طرح زندہ رہتی ہے۔ وہ شکلوں، اجسام، طور طریق، اور رکھ رکھاؤ کو بدلتی رہتی ہے۔ تہذیب کی روایات اور قدریں اندر ہی اندر رواں دواں رہتی ہیں اور زمانہ کی رفتار کا ساتھ دیتی ہیں۔

انسان کی فطرت میں کوئی تبدیلی اور تغیر نہیں ہوا، اس کی فطرت میں جو لوٹ کھسوٹ، چھین جھپٹ، جنگ و جدل، قتل و غارت گری

یا حفاظت کے پیش نظر معاشرتی و اجتماعی طریقۂ زندگی وہ اسی طرح موجود رہے ۔ تاریخ کے ہر دور میں امیر و غریب کی جنگ معاشرے کا اہم واقعہ رہی ہے ۔ تاریخ سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ جب مظلوم قوت و طاقت کا مالک بنتا ہے تو وہ بھی ان ہی طریقوں اور ذریعوں کو اختیار کرتا ہے، جن سے اس نے بغاوت کی تھی ۔ اقتدار و طاقت کا نشہ، انتقام کا جذبہ اور اقتدار کی حفاظت اسے بھی ظالم بنا دیتی ہے ۔ امیر و غریب، ظالم و مظلوم اور طاقت ور و کمزور بدلتے رہتے ہیں اور انسان اس تصادم اور جنگ میں قربان ہوتا رہتا ہے ۔

معاشرے میں عظیم شخصیتوں اور ذہین افراد کا وجود اچانک پیش ہوتا ۔ حالات و واقعات، حادثات اور وجوہات جمع ہوتی رہتی ہیں ۔ اسباب بنتے رہتے ہیں، جب ماحول سازگار ہوتا ہے تو اس وقت معاشرہ کے ہیرو، شعلہ بیان مقرر، اور عظیم رہنما ابھرتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں سے تاریخ کے دھارے کو بدل دیتے ہیں ۔ نپیولین، چرچل، موریس، فورڈ اور لینن یہ سب ہزارہا اسباب و علل کے طور پر ظہور میں آئے ۔ ان کی کامیابی کا دارومدار بھی حالات کے سازگار ہونے پر تھا ۔ لیکن کوئی ایک آدمی، ایک زندگی میں اس قدر با صلاحیت، طاقت ور، اور قوی نہیں ہو سکتا کہ وہ تنہا تہذیب و تمدن میں انقلاب لائے یا روایات و اقدار کو بدل دے ۔ تہذیب کی نشوونما اور ترقی صدیوں کے عمل کے بعد ہوتی ہے ۔ اس میں ہزارہا افراد اور نسلیں اپنی ذہانت، محنت و مشقت اور اپنا خون دیتی ہیں ۔ اگر اس کی تکمیل ایک فرد سے ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ صدیوں کا عمل اس نے تنہا

پورا کیا۔ اس لئے تہذیب و تمدن یا روایات و اقدار کی تکمیل انفرادی طور پر نہیں، اجتماعی طور پر ہوتی ہے۔

ایک روایت دوسری روایت کی جگہ لیتی ہے، ایک قدیم ہو جاتی ہے تو اس کی جگہ لینے کے لئے جدید آگے بڑھتی ہے۔ قدیم و جدید کا یہ تصادم چلتا رہتا ہے۔ قدامت پسند جو قدیم روایات میں جکڑے ہوتے ہیں ان کے لئے ہر نئی چیز اور تبدیلی ایک ضرب کاری ہوتی ہے جو ان کے ماحول اور ان کی زندگی کے سکون اور ٹھہراؤ کو تباہ کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ جب کہ نئی نسل باغی اور انقلابی ہوتی ہے۔ وہ پرانی اور قدیم روایات کو ذہنی طور پر قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتے اس لئے ہر نقش کہن کو مٹانے پر تلے ہوتے ہیں۔ اس تصادم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو پرانی اقدار ایکدم ختم ہوتی ہیں، کیونکہ ان کے پس منظر میں پوری تاریخ ہوتی ہے اور ان کی جڑیں مضبوط اور گہری ہوتی ہیں، اور نہ ہی نئی اقدار اچانک اپنا تسلط جماتی ہیں کیونکہ ان کی مدد کے لئے سوائے جذبات کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس لئے نئے خیالات و افکار اور اقدار جب تک مخالفت کی بھٹی میں پک کر پختہ نہیں ہو جاتے اس وقت تک ان میں مضبوطی پیدا نہیں ہوتی۔ نئی اقدار کا مخالفت کی بھٹی میں پکنا اذیت ناک عمل ہے، لیکن ہر نئی اور جدید چیز کو اس عمل سے گذرنا ضروری ہے، اس کے بعد ہی اس میں پختگی آتی ہے اور اسے معاشرہ میں مقام ملتا ہے۔ اس تصادم کے نتیجہ میں دونوں جانب سے تخلیقی صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں جو معاشرے کی ترقی کے لئے ضروری ہیں۔

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اخلاقی قوانین اٹل نہیں ہوتے بلکہ ان کا مفہوم ہر دور میں حالات کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ انسان جب

وحشت و بربریت کے دور میں تھا تو اس وقت اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے پیچھا کرنا، لڑنا، مارنا، اور چھین جھپٹ کرنا ضروری تھا۔ کیونکہ مرد کو زندگی کی اس جدوجہد میں حصہ لینا پڑتا تھا، اس لئے عورتوں کے مقابلے میں وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہتا تھا، اسی وجہ سے ایک مرد زیادہ عورتیں رکھتا تھا، اور نسل کو بڑھا کر اپنی طاقت میں اضافہ کرتا تھا جب انسان شکاری دور سے کاشتکاری کے دور میں آیا، تو برائی نیکیاں گناہوں میں بدل گئیں، محنت و مشقت، پابندی اوقات اور امن و امان نے زندگی میں مقام حاصل کر لیا۔ اولاد معاشی و اقتصادی نقطۂ نظر سے دولت قرار پائی۔ برتھ کنٹرول غیر اخلاقی اور غیر دانشمندانہ عمل ٹھہرا، باپ خاندان کا سربراہ ہوا، اور اس کی طاقت و اثر کا دارومدار معاشی ضروریات پر تھا۔ لڑکا ۱۵ سال کی عمر میں عملی زندگی میں قدم رکھ کر زمین، ہل، اور عورت کی خواہش کرتا تھا۔ اس لئے کم عمری میں شادی کا رواج ہوا۔ اس دور میں عورتوں اور مردوں کا تناسب برابر کا تھا، اس لئے مرد ایک شادی کرتا تھا۔ کاشتکاری کی یہ روایات اور قدریں ۱۵۰۰ برس تک یورپ میں رائج رہیں۔

صنعتی انقلاب نے معاشرہ کا سماجی و اخلاقی ڈھانچہ بدل کر رکھ دیا۔ مرد اور عورت میں مساوات قائم ہوئی۔ مرد کی برتری کا جذبہ ختم ہوا، اور عورت بھی زندگی کے ہر میدان میں اس کے ساتھ ساتھ اور پہلو بہ پہلو عمل پذیر ہوئی۔ انسان کی جگہ مشین نے لے لی۔ مشینی دور نے زندگی میں مزید پیچیدگیاں پیدا کیں۔ اس کا اثر معاشرے کی قدروں اور روایات پر ہوا۔ اولاد معاشی لحاظ سے خاندان کے لئے دولت اور نعمت نہیں بلکہ مصیبت بن گئی۔ کم عمری کی شادی ختم ہوئی۔ ماں باپ کی سربراہی نے بھی

دم توڑ دیا۔ زندگی کی تلخیوں اور نئی تعلیم نے مذہب کی جڑیں اکھاڑ پھینکیں۔ قدیم اخلاق اور قدیم اقدار و روایات ختم ہوئیں۔ تاریخ کے ایک دور کی برائی دوسرے دور کی نیکی بن گئی۔ انسان کے یہ گناہ' اور اس کی یہ برائیاں اس کے عروج و ترقی کی نشانیاں بن کر رہ گئیں۔

موجودہ دور میں اخلاقی تنزل اور گراوٹ پر ہر طرف سے احتجاج ہے' لیکن تاریخ میں یہ اخلاقی گراوٹ ہر دور میں رہی ہے اور اس پر اسی طرح پر زور احتجاج بھی ہوتا رہا ہے۔ جب لوتھر وٹن برگ یونیورسٹی میں تھا تو اسے نوجوان لڑکیوں سے شکایت تھی جو لڑکوں سے آزادانہ جنسی میل جول رکھتی تھیں۔ جب نیپسوا کی کھدائی ہوئی تو اس میں سے جوا کھیلنے کا پانسہ نکلا' اخلاقی گراوٹ اور برائیوں کا وجود بہت قدیم ہے۔ عیاشی' جنسی بے راہ روی' اور بے ایمانی' یہ ہمیشہ ہر معاشرہ میں رہتی ہیں۔ اسی لئے والٹیر نے تاریخ کو جرائم' بیوقوفیوں' اور آفتوں کا مجموعہ قرار دیا۔ لیکن ان جرائم اور عیاشیوں کے پس منظر میں اکثریت ان لوگوں کی رہی ہے جنھوں نے ایمانداری' محنت و مشقت سے زندگی گذار دی۔ اس لئے موجودہ اخلاقی تنزل ہمارے معاشرے اور قوم کے زوال کا باعث نہیں۔ بلکہ موجودہ اخلاقی گراوٹ کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ دورِ کاشتکاری سے جب صنعتی دور میں داخل ہوا' تو اس نے قدیم روایات اور اقدار پر کاری ضرب لگائی۔ یہ اقدار جنھیں ہم نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں یہ عبوری دور سے گذر کر جب پختگی تک پہونچیں گی تو یہ معاشرے کے لئے قابلِ قبول ہوں گی۔

ابتدائی دور میں مذہب نے اخلاق پر کوئی اثر نہیں ڈالا کیونکہ انسان نے ڈر اور خوف سے دیوتاؤں کو تخلیق کیا تھا۔ اس کے لئے یہ سمندر' دریا

پہاڑ، درخت، ہوا، اور آسمان سب ناقابلِ فہم اور پراسرار تھے، اس لئے اس نے ہر اس چیز کی پرستش شروع کر دی جو اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ فطری بلاؤں اور آسمانی آفتوں سے محفوظ رہنے کے لئے نذرانے اور قربانی دی۔ دیوتاؤں سے مدد کے لئے دعائیں مانگیں۔ جب آگے چل کر مذہب میں پجاریوں کی جماعت پیدا ہوئی تو انھوں نے دیوتاؤں کے خوف سے کام لیتے ہوئے افراد کے اخلاق کو سنوارا۔ اس وقت سے مذہب اور اخلاق میں تعلق قائم ہوا۔

مذہب ہمیشہ غریب، بے بس، اور مایوس افراد کے لئے روحانی تسکین کا باعث رہا ہے۔ یورپ میں مذہب کا اثر ختم ہو گیا، لیکن سماجی تنظیم کے لئے اب بھی اس کا سہارا لیا جاتا ہے۔ روس میں مذہب کی جگہ اشتراکیت نے لے لی۔ اگر اشتراکیت غربت کو دور کرنے میں ناکام رہی تو انسان پھر روحانی تسکین کی خاطر مذہب کو اختیار کرے گا۔ کیونکہ صرف مابعد الطبیعاتی تصورات انسان کو سکون دیتے ہیں، اس لئے دنیا میں جب تک مفلسی اور غربت رہے گی اس وقت تک خدا اور مذہب کا بھی وجود برقرار رہے گا۔

ول ڈیورانٹ تاریخ کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ معاشرہ میں ہمیشہ اقلیت حکمرانی کرتی ہے اور اکثریت اس کے اثر و اقتدار اور حکومت میں رہنا گوارا کرتی ہے۔ اقلیت کے غلبہ کی وجہ یہ ہے کہ ہر فرد کی ذہانت یکساں نہیں ہوتی، بلکہ بہت کم افراد کو یہ نعمت ملتی ہے۔ اس لئے یہ ذہین افراد اپنی ذہانت سے ایک ممتاز مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ جہالت اور توہمات سے دور رہتے ہیں اور سازگار ماحول کو اپنی موافقت میں ڈھال لیتے ہیں۔ وہ سیاست اور دولت پر قابض ہو کر انتہائی طاقت ور بن جاتے

ہیں۔ دولت مندوں کی ہوس بڑھتی رہتی ہے۔ لالچ اور طمع انھیں اندھا کر دیتی ہے۔ وہ غریب کی محنت اور مشقت کے سلسلہ میں دولت بڑھاتے رہتے ہیں۔ یہ صورت حال معاشرے کے توازن کو بگاڑ دیتی ہے۔ اس وقت ناانصافی، ظلم، اور طبقاتی تقسیم کے خلاف آواز اٹھتی ہے۔ معاشرہ ایک بحران سے دوچار ہوتا ہے، ایک شدید کشمکش ظہور میں آتی ہے۔
اس وقت معاشرے کے سامنے دو صورتیں ہوتی ہیں: یا تو قانونی طریقہ سے دولت کی تقسیم کی جائے اور اس بات کی کوشش کی جائے کہ دولت کا ارتکاز ایک جماعت میں نہ ہو، یا پھر انقلاب کے ذریعے سے دولت کے ارتکاز کو ختم کیا جائے اور پورے معاشرے کو یکساں کر دیا جائے۔
آج کے معاشرے میں اشتراکیت اور سرمایہ داری دو متضاد نظریوں کی حیثیت سے ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ دورِ سرمایہ داری میں معاشرہ خاص ماحول اور حالات میں ترقی کرتا ہے۔ سرمایہ دار دولت جمع کرتا ہے۔ اسے صنعت و حرفت میں لگاتا ہے۔ صنعتی ترقی میں اضافہ کرتا ہے۔ پیداوار اور اشیاءِ ضرورت بڑھاتا ہے۔ معاشرے کے افراد کو ملازمت اور روزگار فراہم کرتا ہے۔ لیکن سرمایہ دار دولت کی تقسیم میں ایمانداری سے کام نہیں لیتا، وہ اپنے حصّہ سے بڑھ کر دوسروں کے حصّے کو بھی غصب کر لیتا ہے۔ اس لئے سرمایہ دار کی لوٹ کھسوٹ، دھوکہ دہی، بے ایمانی، ظلم و جبر، اور استحصال کے خلاف ہر دور میں آواز اٹھتی رہی ہے اور احتجاج کے طور پر اشتراکی نظام قائم ہوتے رہے ہیں۔
تاریخ کی شاید سب سے طویل اشتراکی حکومت جنوبی امریکہ میں انکاز نے تیرھویں صدی میں قائم کی تھی جو ۱۵۳۳ء میں اسپین کی فتح کے بعد ختم ہوئی۔ اس اشتراکی نظامِ حکومت میں، حکومت ہر فرد کے بارے میں

پوری معلومات رکھتی تھی ۔ ملک کی آبادی کے اعداد و شمار اور ان کی آمدنی کا حساب رکھا جاتا تھا ۔ پورے ملک میں زمین یکساں طور میں تقسیم کردی گئی تھی ۔ ذرائع آمد و رفت کی سہولتیں پوری طرح موجود تھیں ملک کا ہر باشندہ براہِ راست حکومت کا ملازم ہوتا تھا ۔ چونکہ حکومت کی جانب سے ہر فرد کو اس کی بنیادی احتیاجات مہیا کی جاتی تھیں اور حکومت اس کی جان و مال و ملازمت کی ذمہ دار تھی، اس لئے ہر شخص خوشی خوشی حکومت کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار رہتا تھا ۔

روس میں اشتراکی انقلاب کی وجہ زار کا ظلم و تشدد، روس کی جنگ میں شکست، خراب انتظام سلطنت، ابتر معاشی حالت، محاذِ جنگ سے لوٹے ہوئے زخمی، اور بے سہارا فاقہ کش کسان اور سپاہی تھا ۔ ان سب سے بڑھ کر لینن کی پر جوش اور پر خلوص قیادت نے زار کے خلاف انقلاب کی شکل اختیار کرلی ۔ اس وقت روس اندرون اور بیرونی خطرات میں گھرا ہوا تھا، اس لئے جب انقلابی حکومت نے اعلان کیا کہ وہ ملک کی حفاظت کریں گے تو معاشرہ کے ہر فرد نے امن و امان، حفاظت اور معاشی مساوات کی خاطر اپنی آزادی کو حکومت کے سپرد کردیا ۔

کیا اشتراکی نظام فرد کی آزادی کو ہمیشہ اپنے تسلط میں رکھے گا؟ اس کا جواب مسٹر ڈیوارانٹ نفی میں دیتا ہے ۔ ہر شخص فطری طور پر آزادی کا خواہش مند ہوتا ہے ۔ اس لئے آزادی سے محرومی ذہنی اذیت ہے جو زیادہ عرصہ برداشت نہیں کی جائے گی ۔ جب پرانی نسل، جنھوں نے انقلاب میں حصہ لیا اور نئے معاشرے کی تشکیل میں شرکت کی، ختم ہوگی اور اس کی جگہ نئی نسل لے گی، اسے امن و امان کا زمانہ ملے گا، ملک کو کسی بیرونی حملے کا خطرہ نہیں ہوگا تو اس وقت وہ یقیناً آزادی کا

مطالبہ کریں گے ۔ روس کی موجودہ اشتراکی حکومت کے رویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس نظام میں لچک پیدا کرنے کی خاطر آہستہ آہستہ اپنی سخت پالیسی میں ترمیم کر رہے ہیں اور فرد کو آزادی دے رہے ہیں۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے تصادم کا نتیجہ مفید برآمد ہو رہا ہے سرمایہ دار ممالک اشتراکی انقلاب کے خوف سے معاشرہ میں دولت کی زیادہ تقسیم اور مساوات پر زور دے رہے ہیں ۔ اس کے برعکس اشتراکی حکومتیں سرمایہ داری کے ڈر سے فرد کو آزادی دے رہی ہیں۔ اس کا نتیجہ دیکھتے ہوئے امید ہوتی ہے کہ ان دو نظاموں میں ہم آہنگی اور ملاپ ہو جائے گا' جو ایک متوازن معاشرہ قائم کرنے میں مدد دے گا

تاریخ کے اس طویل سلسلہ میں جب ان نظاموں پر نظر ڈالی جاتی ہے جنہوں نے معاشرہ کو منظم کیا ۔ افراد کو امن و امان کی پرسکون زندگی دی ۔ یا اس کے برعکس ان پر ظلم و تشدد اور دہشت کے ذریعہ قابو پایا گیا' اور انہیں غربت و مفلسی کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا' تو ان میں سب سے اول نظامِ بادشاہت آتا ہے جو اپنی خوبیوں اور برائیوں کے لحاظ سے برابر رہا ۔ جب یہ دیکھا گیا کہ ایک فرد اور ذہن بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کو حل نہیں کر سکتا تو "چند سری" حکومت کا قیام عمل میں آیا ۔ لیکن پوری تاریخ میں اکثریت کو کبھی حکومت کا موقع نہیں ملا' کیونکہ اکثریت ایک نقطۂ نظر اور پالیسی پر متحد نہیں ہو سکتی' اس لئے اقلیت حکومت و اقتدار پر قبضہ کر لیتی ہے۔ اکثریت یہ ضرور کر سکتی ہے کہ جب بھی اقلیت طاقت و اقتدار کو ناجائز طور پر استعمال کرے تو اس کے خلاف بغاوت کر کے حکومت کو دوسرے گروہ یا جماعت کے سپرد کر دے ۔

انقلابات کی وجوہات ہمیشہ معاشی رہی ہیں ۔ انقلابِ فرانس زمینداروں
اور امراء کی دولت ، عیش و آرام اور ان کے اختیارات کے خلاف ایک
آواز تھی ۔ برطانیہ وہ واحد ملک ہے جس نے معاشرہ میں تبدیلیاں
انقلاب سے نہیں بلکہ ارتقائی عمل سے کیں ۔ انقلاب اور ارتقاء کے نتائج
بالکل متضاد ہوتے ہیں ۔ انقلاب ہر شے کو تہس نہس کر کے پورے نظام
کو تبدیل کر دیتا ہے ، جب کہ ارتقائی عمل میں معاشرہ ماضی سے رشتہ نہیں
توڑتا ، اور اپنی روایات اور اقدار کو ساتھ لے کر چلتا ہے ۔ معاشرہ
کا اپنی روایات سے اچانک لاتعلق ہونا ، یا انہیں نوچ پھینکنا ، معاشرہ
کو زخمی اور مفلوج کر دیتا ہے ، کیونکہ جس طرح ایک فرد کی ذات اس
کی قوتِ یادداشت پر منحصر ہوتی ہے ، اسی طرح معاشرہ کی زندگی
مسلسل روایات اور اقدار پر ہوتی ہے ، اور اس رشتہ کو یکسر ختم کرنا
معاشرہ کو تنزل کی جانب لے جاتا ہے ۔

خونی انقلاب دولت کو منصفانہ اور بہتر طریقے سے تقسیم کے باعث سے
ضائع کرتے ہیں ۔ یہ ضرور ہوتا ہے کہ معاشرہ کا با اختیار دولتمند طبقہ
ختم ہو جاتا ہے اور معاشی مساوات قائم ہو جاتی ہے ، لیکن یہ معاشی و
سماجی مساوات دوسری طرف غیر سیاسی مساوات پیدا کر دیتی ہے ۔ کیونکہ
اقلیت پھر سیاسی طاقت و قوت کے ذریعہ ممتاز مقام حاصل کر لیتی ہے ۔

تمام طرزِ حکومتوں میں جمہوری نظام سب سے زیادہ مشکل اور پیچیدہ ہے ۔
کیونکہ اس نظام میں ہر شخص حکومت کی تشکیل میں حصہ لیتا ہے ، اس لیے
ضروری ہے کہ اس کی ذہنی استعداد اس قدر بلند ہو کہ وہ حکومت کے
معاملات کو سمجھ سکے ۔ اس سیاسی سوجھ بوجھ کے لئے تعلیم کا ہونا
لازمی ہے ۔ حقیقی جمہوریت اسی صورت میں قائم ہو سکتی ہے کہ جب

معاشرہ کا ہر فرد تعلیم یافتہ ہو۔ برطانیہ، امریکہ، ڈنمارک، ناروے، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، اور کینیڈا میں جمہوریت مستحکم ہو چکی ہے، لیکن دوسرے ممالک میں جمہوریت کو طبقاتی کشمکش، دولت کی غیر مساوی تقسیم اور سیاسی نعرہ بازی و باہمی نفرت سے بڑا خطرہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے ان ملکوں میں آمرانہ نظامِ حکومت آسانی سے قائم ہو جاتا ہے۔ اور فوجی حکومتیں خوبصورت و دلفریب انقلابی نعروں سے جمہوریت کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔

۳۴۲۱ سال کی وہ طویل مدت ہے جس کا تاریخی سرمایہ مورخ ضابطۂ تحریر میں لے آئے ہیں، اس مدت میں صرف ۲۶۸ سال ایسے گذرے ہیں جن میں کوئی جنگ نہیں ہوئی، ورنہ تاریخ انسانی خوں ریز جنگوں، قتل و غارتگری، اور کشت و خون سے بھری ہوئی ہے۔ جنگ اور خوں ریزی انسان کے مقدر میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جنگ ایک مقابلہ کا نام ہے جو انسانوں اور اقوامِ عالم کے وجود کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ اس لئے دنیا میں شدید اور تباہ کن جنگیں ہوتی رہی ہیں۔ ایک خوں ریز جنگ انسان کی صدیوں کی محنت سے تعمیر کی ہوئی عمارتیں، شہر، اور فن و آرٹ کو ختم کر دیتی ہے۔ دو عالمی جنگوں نے جو تباہی و بربادی کی وہ آج بھی نگاہوں کے سامنے ہے۔ ان دو جنگوں کے دوران جو فنی و سائنسی ترقی ہوئی اور جنگوں کے خاتمہ کے بعد اس سائنس کو انسان کی بہتری اور امن کے لئے استعمال کیا گیا، یہ معمولی سا فائدہ ہے جس سے دنیا فیض یاب ہوئی۔

کیا دنیا سے ہمیشہ کے لئے جنگ ختم ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے وِل ڈیورانٹ کہتا ہے کہ معاشرہ میں جنگ پسند طبقہ ہمیشہ جنگ کی

حمایت کرتا ہے ۔ جب کہ ٹالسٹائی اس کی مخالفت کرتے ہیں، لیکن آخر میں وہ بھی اس بات پر متفق ہو جاتے ہیں کہ طویل امن قوموں کی بیداری، جوش اور جرأت کو زنگ لگا دیتا ہے ۔ اس لئے جنگ ضروری ہے تاکہ معاشرے کا جمود ٹوٹے ۔

موجودہ حالات کی روشنی میں جنگ کے خطرے کو روکنا بڑا مشکل ہے، کیونکہ اشتراکی اور سرمایہ دار حکومتیں ایک دوسرے کو ختم کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہیں ۔ آپس کا یہ مقابلہ اور تصادم اسی صورت میں ختم ہو سکتا ہے کہ جب زمین کی مخلوق کو، کوئی بیرونی خطرہ ہو ۔ اس سے بچاؤ اور حفاظت کے لئے زمین کی تمام طاقتیں متحد ہو سکتی ہیں، ورنہ نہیں ۔

کیا تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے؟ ول ڈیورانٹ اس کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ معمولی تو ایسا ہوتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے کیونکہ کچھ ایسے واقعات ہیں جو ایک نظام کے تحت بار بار وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں ۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مستقبل میں نئی ریاستیں وجود میں آئیں گی، پرانی ختم ہو جائیں گی، پیچیدہ مسائل پیدا ہوں گے، دانشور معاشرے کی غلطیوں اور حالت زار پر قلم اٹھائیں گے، نئی نسل پرانی نسل سے بغاوت کرے گی اور بالاخر وہ بھی قدامت پسندی کی روش اختیار کرے گی ۔ لیکن تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مستقبل نے ہر لمحہ، یا ماہ و سال کو ماضی کے نمونہ پر دہرایا ہو ۔ مستقبل نئے خیالات و افکار سے مزین ہوتا ہے، وہ تیزی سے آگے بڑھتا ہے اس لئے اسے عمرِ رفتہ کو آواز دینے کی فرصت نہیں ہوتی ۔

ول ڈیورانٹ جب اس مسئلہ پر غور کرتا ہے کہ تہذیبیں کیونکر بڑھتی ہیں،

پھیلتی ہیں، پھر سمٹ کر تنگ ہو جاتی ہیں، اور آخر گھٹ کر مر جاتی ہیں۔ اس کے خیال میں اس تمام عمل میں کسی پر اسرار طاقت کا ہاتھ نہیں ہوتا، بلکہ تہذیب کے خاتمہ کی وجہ سیاسی و معاشی اقتدار کا زوال، افراد کے کردار کی کمزوری، جس کی وجہ سے پیچیدہ مسائل حل نہیں ہو سکتے، اس لئے تہذیب جو حالات کے ساتھ بدلنا چاہتی ہے، وہ ساکت ہو کر زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ تہذیب ساکت و جامد تو ہو سکتی ہے، اس کی ترقی تو رک سکتی ہے، لیکن تہذیب کبھی مرتی نہیں، بلکہ ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔

یونانی تہذیب اب تک انسانوں کے ذہن میں زندہ ہے۔ ہومر کی شاعری آج تک درخشندہ و تابندہ ہے۔ یونانی فلسفیوں، شاعروں، اور دانشوروں کی کتابیں ہر لائبریری کی زینت ہیں۔ افلاطون کے فلسفہ و افکار کو ہزارہا نقطۂ نظر سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس لئے تہذیب کے منتخب تخلیقی ذہن جو افکار تخلیق کرتے ہیں وہ ابدی اور لازوال ہوتے ہیں۔

قومیں مر جاتی ہیں، مگر تہذیب زندہ رہتی ہے۔ تاریخ میں ایسی ہزارہا مثالیں ہیں کہ جب کوئی سرزمین بنجر اور ویران ہو جاتی ہے، لوگوں کو غذا اور زندگی کی تمام ضروریات حاصل کرنے میں دشواری اور دقت پیش آتی ہے، کام کرنے کے مواقع کم سے کم ہوتے چلے جاتے ہیں، تو اس وقت من چلے اور مہم جو افراد اپنا وطن اور ملک چھوڑ کر دوسری سرزمین آباد کرنے چلے جاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ساتھ اپنی تہذیب و تمدن، ثقافت، روایات و اقدار، اور مصنوعات کو بھی لے جاتے ہیں۔ اس طرح تہذیب ان کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہے اور جہاں وہ آباد ہوتے ہیں، وہاں وہ بھی اپنا اثر اور تسلط جماتی ہے۔ اس کے علاوہ تہذیب اپنے علاقہ کو چھوڑ کر، دوسرے علاقوں اور لوگوں کو بھی متاثر کرتی ہے۔

جیسے روم نے یونانی تہذیب کو اختیار کر لیا، مغربی یورپ نے اسے روم سے میراث میں پایا، امریکہ نے اسے مغربی یورپ سے لیا، اور اب امریکہ اسے کسی اور کے حوالے کر دے گا۔ تہذیب و تمدن ایک جاری سلسلہ ہے جب ایک نسل اس کے بوجھ کی شدت سے تھک جاتی ہے تو یہ اپنا تہذیبی بوجھ آنے والی نسل کے سپرد کر دیتی ہے، چاہے اس کے یہ وارث کسی علاقہ میں رہتے ہوں، وہ اس میراث کے حقدار اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر تہذیب اپنی روح کو محفوظ رکھتی ہے اور ان تمام روایات کو بھی جو اسے مختلف نسلوں سے ملتی ہیں۔

زمانہ حال اور ماضی میں کون فوقیت رکھتا ہے؟ کیا ماضی نے اپنی شاندار روایات اور ترقی سے زمانہ حال کو شکست دیدی ہے؟ اس کے جواب میں ول ڈیورانٹ کہتا ہے کہ زمانہ حال نے انسانی تہذیب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے: فنی و سائنسی ترقی، قحط کا خاتمہ، غذا کی بہتات، توہمات اور مذہبی عناد و نفرت کا زوال، مشینوں کی ایجاد، انسانی محنت و مشقت میں کمی، اور سکون و آرام کے لمحات میسر آنا، اور بہترین تعلیم، یہ سب حال کے کارنامے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں ماضی بھی اپنے دامن میں گوہر نایاب لئے ہوئے ہے۔ آگ کی ایجاد، پہیہ کی تخلیق، شکار اور کاشتکاری کے ہتھیار و آلات، خاندان کے افراد کی تنظیم۔ اخلاق و شرافت اور سخاوت کی قدروں کا فروغ، تہذیبی تجربات کی منتقلی، یہ ماضی کی میراث ہیں، جو زمانۂ حال کو ملی ہیں۔

تہذیب ایک نسل سے دوسری نسل میں کس طرح منتقل ہوتی ہے؟ ول ڈیورانٹ اس کو تعلیم کا معجزہ قرار دیتا ہے۔ تعلیم کے ذریعہ نئی نسل تہذیب

کے ورثہ کو حاصل کرتی ہے۔ یہ ورثہ حاصل کرنے کے لئے اسے سخت محنت کرنی پڑتی ہے، لیکن اگر تہذیب کی منتقلی میں ایک صدی کی تاخیر ہو جائے تو اس صورت میں تہذیب فنا ہو جائے گی اور انسان پھر سے وحشی اور غیر مہذب ہو جائے گا۔

موجودہ زمانہ کے انسان کو اس بات پر فخر ہے کہ اس نے تعلیم کے ذریعے کائنات کے سربستہ رازوں پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ آج ایک معمولی پڑھا لکھا شخص اس کائنات کے بارے میں پوری پوری معلومات رکھتا ہے، کیونکہ ہماری تہذیب ماضی کے ورثہ کو محفوظ کئے ہوئے ہے اور خود بھی اس میں اضافہ کیا ہے، اس لئے موجودہ دور کے انسان کی ذمہ داریاں بہت مشکل ہیں۔ موجودہ ترقی یافتہ تہذیب میں یونانی تہذیب کی دانشمندی، اور حکمت موجود ہے۔ یہ لیونارڈو کے زمانہ سے برتر ہے کیونکہ اس میں اٹلی کی نشاۃ ثانیہ کی تمام قدریں ہیں۔ یہ والٹیئر کے زمانہ سے زیادہ عظیم ہے، کیونکہ اس میں انقلاب فرانس کے تمام اثرات ہیں۔ اس لئے اس تہذیب کو محفوظ رکھنا، اس میں اضافہ کرنا، اور پھر اسے آنے والی نسل کے حوالے کرنا، اس دور کے انسان کے اہم فرائض ہیں۔

کتابخانہ / محمد ہارون موسیٰ

T
7.